

مکمل ناول

ایک عمر کے بعد؟

نہت سیا



”اور یہ میں ہوں سویرا اقبال.....“ میں نے
آسانی ساڑی کا پلو کندھے پر ڈالتے ہوئے اچھا
جانکا لیا۔

”دنیا نے ادب کا ایک درخشاں ستارہ اور
ایک ڈستے دار سرکاری افسر..... لوگ کہتے ہیں
میں بہت کامیاب عورت ہوں لیکن کیا میں واقعی
کامیاب ہوں.....؟ بھئی، بھئی مجھے لگتا ہے جیسے
میں دنیا کی ناکام ترین عورت ہوں۔ زندگی کے ہر



میدان میں جھنڈے گاڑنے کے باوجود میرے جیسی ناکام عورت کوئی نہیں..... اور اس ناکام عورت کی زندگی پر بے شمار لوگ رشک کرتے ہیں..... صبح سے لے کر شام تک کتنی ہی بار یہ جملے میرے کانوں میں پڑتے ہیں۔

"میم! آپ بہت خوش قسمت ہیں۔"

"ارے سویرا اقبال بہت لگی ہیں۔"

ہاں ان کی نظروں میں واقعی میں خوش قسمت ہوں، کیا نہیں ہے میرے پاس دولت، شہرت، عزت، حسن، دلکشی..... ہاں سبھی کچھ تو ہے بس.....

میں نے ایک بار پھر خود کو آئینے میں جانچا..... میں کوئی ایسی حسین و جمیل نہیں ہوں کہ جس کے حسن کی تعریف میں صلے کے صلے سیاہ کر دیے جائیں لیکن اتنی خوب صورت ضرور ہوں کہ اکثر میں نے مردوں کی نظریں اپنی طرف اٹھتی اور پھر ٹھہرتی محسوس کی ہیں..... حالانکہ میں کوئی جوان لڑکی نہیں..... میری عمر تیس سال ہے۔ یہ الگ بات ہے میں تیس سال کی عمر میں بھی کچیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی۔

میں نے ڈریسنگ ٹیبل سے اپنا قیمتی پرلیوم اٹھا کر اس پرے کیا اور ایک آخری نظر آئینے پر ڈال کر باہر نکل تو براہے میں ماسی خیراں کھڑی تھی۔

"میڈم جی وہ سراج الحق اور عرفان منیر صاحب آئے ہیں۔ وہی جی اخبار والے۔"

میں نے کھائی موڑ کر وقت دیکھا..... میں پہلے ہی لیٹ تھی۔ آج ضلع کے تمام اسکولوں کے سربراہوں کے ساتھ میری میٹنگ تھی..... میٹنگ دس بجے تھی اور اس وقت نو بجے تھے..... میں عموماً آٹھ بجے تک آفس چلی جاتی تھی لیکن پچھلے دو ہفتوں میں مسلسل کام کی زیادتی نے مجھے تھکا دیا تھا۔ بہت سارے کام نبھانے کے بعد میں رات نیند کی گولی کھا کر سوئی تو صبح میری آنکھ دیر سے کھلی تھی..... مجھے یہاں آئے دو ہفتے ہی ہوئے تھے اور ان دو ہفتوں

میں بے حد مصروف رہی تھی۔ میرے آفس میں بہت سی فائلیں تھیں جنہیں دیکھنا تھا۔ ملاقاتیوں کی آمد اور انہیں مطمئن کرنا، کسی کی پینشن کا مسئلہ تھا، کوئی پینس ویلنٹ فنڈ کے اجراء کے لیے خواہ ہو رہا تھا۔ کسی کے ڈیوڑا ادا نہیں ہوئے تھے، کسی کو اپنا گریڈ چاہیے تھا اور کسی کو اپنے علاقے میں ٹرانسفر کروانا تھا..... دراصل ڈی ای او کی یہ سیٹ پچھلے دو ماہ سے خالی پڑی تھی اور بہت سے کام رکے ہوئے تھے۔ میں اس شہر میں نئی تھی اور چاہتی تھی کہ لوگوں پر میرا اچھا تاثر ہو اور میں انہیں مطمئن کر سکوں..... بظاہر تو سب نے ہی میری پوسٹنگ پر خوشی کا اظہار کیا تھا اندر کا حال اللہ جانتا ہے۔ غیر رسمی طور پر میری ملاقات چند ملل اور پرائمری اسکولوں کے ہیڈ سے ہو چکی تھی اور مجھے علم ہوا تھا کہ کچھ پرائمری اور ملل اسکولوں میں بچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک ملل اسکول کی ہیڈ نے مجھے بتایا کہ اس کے اسکول میں صرف کچیس طالبات ہیں، یہ نگر انتہائی پریشان کن تھا۔ سرکاری اسکولوں میں تعلیم لری ہونے کے باوجود لوگوں کا رجحان ابتدائی کلاسوں میں پرائیویٹ اسکولوں میں زیادہ کیوں ہے..... ایسے اسکول جن میں طالبات کی تعداد زیادہ نہیں ہے ختم ہو جانے چاہئیں کہ یہ حکومت کے خزانے پر بوجھ ہیں۔ ہاں ہائی اسکولوں میں تعداد بہت زیادہ تھی۔ جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ والدین بنیادی تعلیم کے لیے پرائیویٹ اسکولوں کے اخراجات برداشت کر لیتے ہیں لیکن ہائی کلاسز کے نہیں..... گورنمنٹ ٹیچرز کی تنخوائیں بہت تھیں..... جن کی سروس زیادہ تھی وہ کافی زیادہ تنخواہ لے رہے تھے پھر دوسری سہولتیں نقل عینشن اس کے باوجود معیار تعلیم پرائیویٹ اسکولوں کے مقابلے میں بہتر کیوں نہیں تھا..... اسی سب پر بات کرنے کے لیے میں نے یہ میٹنگ رکھی تھی۔ میں جانتی تھی میری باتیں کچھ کو بری لگیں گی..... لیکن مجھے کرنا بھی ضرور

اگے عمر کے بعد

میم.....! "سراج الحق کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں میں بلا کی مکاری تھی۔

"جی فرمائیں، میرے لائق کیا خدمت ہے؟" میں نے خیراں کو جوس لانے کے لیے کہا اور بیٹھ گئی۔

"اچھوٹا ہی ہم آپ کا انٹرویو لینا چاہتے ہیں، اپنے اخبار کے لیے..... میں دراصل ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا ہوں۔"

"لیکن میرا انٹرویو کس سلسلے میں.....؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا آپ برائے آنے والی ڈی ای او کا انٹرویو اپنے اخبار میں چھاپتے ہیں؟"

"ہر ڈی ای او سویرا اقبال نہیں ہوتی۔" اس کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی مجھے حیرت ہوئی تھی۔

"سویرا اقبال میں ایسی کیا خاص بات ہے؟" میں نے اپنی حیرت چھپائی۔

"خاص بات.....؟" اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"آپ کی جی جگ نے تو تہلکہ مچا رکھا ہے جناب۔" اب کے وہ کھل کے سامنے آیا تھا۔ "مضامین پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔"

"اوہ....." میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ شخص انتہائی کانیاں تھا، پتا نہیں اس کی معلومات کا ذریعہ کیا تھا۔ ورنہ میری حتی الامکان یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ میں کون ہوں..... سویرا اقبال نام کی صرف ایک میں ہی تو نہیں سیکڑوں لڑکیاں ہوں گی..... لیکن اس نے جس یقین سے بات کی تھی لگتا تھا کہ یہ شخص پورا ہوم ورک کر کے آیا ہے، سواب حکمرانے کا کوئی قائدہ نہیں تھا..... البتہ دل میں مجھے انتہائی کوفت ہوئی تھی..... پچھلے شہر میں تقریباً دو سال میرا قیام رہا تھا

تھیں کہ کم تنخواہ میں پرائیویٹ اسکولوں کے ٹیچرز اتنی محنت کرتے ہیں تو سرکاری اسکولز کے ٹیچرز کیوں نہیں کر سکتے اور مجھے یقین تھا کہ میری بات سنی جائے گی..... اور ہم کوئی حل نکال لیں گے۔

"میڈم جی.....!"

ماسی خیراں نے مجھے پھر پکارا تو میں نے چونکر کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا کہوں جی انہیں.....؟"

"اچھا چلو میں آتی ہوں، تم جوس لے آنا۔" میں نے ایک گہری سانس لی اور سوچا کھڑے، کھڑے ہی بات کر لوں..... یہ شخص پچھلے تین دنوں سے آفس آرہا تھا اور میں مل نہیں پاری تھی حالانکہ میرے آفس کے کلرک نے مجھے چھپے لفظوں میں ڈرانے کی بھی کوشش کی تھی کہ مجھے اخبار والوں کے ساتھ بنا کر رکھنی چاہیے کہ انہوں نے کچھ خلاف چھاپ دیا تو کون تردید کرتا پھرے گا۔ میں یہ بات جانتی تھی کہ کلرک سچ کہہ رہا ہے۔ اپنی دس سالہ جاب کے تجربے نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا..... جاب کے دو، تین سال کے بعد ہی میں نے جان لیا تھا کہ مجھے لوگوں کے ساتھ کیسے اور کس طرح کاروبار رکھنا ہے۔ سو میں نے سراج الحق اور عرفان منیر سے اپنی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے معذرت کر کے دو تین روز کی سہلت چاہی تھی لیکن یہ آج آفس کے بجائے گھر آگئے تھے اور اگر اس وقت میں نہ ملتی تو یقیناً وہ انسلٹ محسوس کرتے۔ میں خیراں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی تو وہ دونوں کھڑے ہو گئے..... دونوں کی نظروں میں موجود اشتیاق کو بھانپتے ہوئے میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تشریف رکھیں پلیز..... میں معذرت خواہ ہوں کہ پہلے ملاقات نہیں کر سکی..... دراصل کام کی بے تحاشا مصروفیت ہے..... اور....."

"ہم آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لیں گے

لیکن کسی کو علم نہیں ہو سکا تھا کہ میں وہی سویرا اقبال ہوں جس کی شاعری کی دھوم ہے۔ میں اس سلسلے میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ سراج الحق نے اس طرح چٹائی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو..... دیکھا تازے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ اب وہ میری شاعری کی تعریف میں رطب اللسان تھا..... عرفان منیر نے بھی تعریف کرنے کے بعد مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ دیا۔

”سویری، میں مشاعروں میں نہیں جاتی۔“
”لیکن یہ مشاعرہ تو ہم آپ کے اعزاز میں کر رہے ہیں۔ آپ کا ہمارے شہر میں آنا ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے۔“

”میرے لیے بھی یہ اعزاز ہے، عرفان صاحب کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ اس عزت افزائی کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں..... لیکن میں نے جب اس خانہ زاد میں قدم رکھا تھا تو اپنے لیے کچھ اصول بھی بنائے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مجھے مشاعرہ نہیں پڑھنا تو میں معذرت خواہ ہوں کہ اپنا اصول تو نہیں سکتی۔“

عرفان منیر کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔
”اور انٹرویو میڈم..... وہ تو آپ دے رہی ہیں ناں.....“ سراج الحق کا لہجہ اب بھی پر یقین تھا۔
”پچھلے تیرہ سالوں سے میرا کلام اور میری کہانیاں ادبی پرچوں میں چھپ رہی ہیں۔ کیا آپ نے کبھی نہیں میرا انٹرویو دیکھا، پڑھا؟“

”نہیں.....“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے انٹرویو کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔“

”چلیں وعدہ رہا جب کبھی میرا ارادہ بنا انٹرویو دینے کا تو یہ اعزاز آپ کے اخبار کو ہی ملے گا۔“ میں نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ سمائی..... میں جانتی تھی کہ اگر یہ لوگ کبھی کسی مشکل میں کام آسکتے ہیں تو

میرا بیٹا بھی حرام کر سکتے ہیں۔
”میری خوش قسمتی ہوتی اگر آپ کا انٹرویو ہمارے اخبار میں چھپ جاتا۔“ سراج الحق کے لہجے میں ہلکی رکھائی تھی جسے میں نے محسوس کیا۔
”بہر حال آپ کو مجبور تو نہیں کیا جاسکتا..... یہی اعزاز کیا کم ہے کہ آپ نے ملاقات کا شرف بخشا۔“
بظاہر وہ بچھا چارہ تھا لیکن میں سمجھ سکتی تھی کہ میرے سامنے بیٹھا شخص کس قدر منافق اور دوغلا ہے۔

”کیا غضب کا لگھشتی ہیں آپ..... جیسے تحریر نہیں سوتیلوں کی مالا ہے۔ ایک، ایک لفظ سونے میں تلنے والا۔ ویسے کیا آپ کے خاندان میں کسی اور کو بھی ادب سے دیکھا ہے؟“ عرفان منیر بھی سراج الحق سے کم چالاک نہیں لگ رہا تھا۔

”نہیں.....“ میں نے مختصر جواب دے کر ماسی خیراں کی طرف دیکھا جو انہیں جوس پیش کر رہی تھی۔
”آپ کے والد بھی کیا ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ سے متعلق ہیں؟“ گویا وہ غیر رسمی انٹرویو کا آغاز کر چکا تھا۔
”نہیں.....“

میرا جواب اب بھی مختصر تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ میرے متعلق جاننا چاہتا ہے اور میں ایسا نہیں چاہتی تھی..... میں نے کلائی موڑ کر ٹائم دیکھا حالانکہ میرے ہاتھ لکھنا نہیں کھاتا تھا۔
”اقبال آپ کے والد کا نام ہے یا.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”نہیں، یہ میرے نام کا حصہ ہے۔“ میں نے پھر کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور بالآخر سراج نے سمجھ لیا جو میں سمجھانا چاہتی تھی۔

”اوہ سویری، آپ کو دیر ہو رہی ہے۔“ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ ”انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“
”ضرور.....“ میں اخلافا مسکرائی۔

”انٹرویو کے متعلق ضرور سوچے گا میم..... آپ

آلہ عمر کے بعد

نہیں سمجھتی تھی بلکہ اپنے منافقت بھرے روپے کو اپنی مجبوری گردانتی تھی۔ اگر میں یہ روپہ تندرکھوں تو یہ لوگ تو مجھے کچا کھا جائیں۔۔۔۔۔ اور یہ میں نے بہت پہلے جان لیا تھا۔۔۔۔۔ اور لوگوں کے ہاتھ کی خباثتیں دیکھنا سیکھ لی تھیں۔

”میڈم جی آپ نے آفس نہیں جانا؟“ ماسی خیراں نے ٹیبل سے خالی گلاس اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں نے چونکتے ہوئے کلاک پر نظر ڈالی۔ پونے دس ہو رہے تھے۔ یک دم میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔۔۔۔۔ اور ایسا ہوتا تھا۔ ماسی۔۔۔۔۔ میں ایک گہری سانس لے کر وہاں ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ اور چنڈ بیگ سے اپنا فون نکال کر اپنے آفس کے ٹھکر ساجد خان کو فون کر کے میٹنگ کنسل کرنے کے لیے کہا۔

”جی خدمت ہے ناں۔۔۔۔۔؟“

”ہاں ساجد کوئی مسئلہ ہے۔۔۔۔۔ مجھے کہیں جانا ہے۔ دوبارہ کب میٹنگ ہوگی پھر بتا دوں گی۔۔۔۔۔ کوئی آیا تو نہیں ہے ابھی تک؟“

”نہیں میڈم۔۔۔۔۔! صرف ایک پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹر ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم سب کو فون کر کے بتا دو۔“ میں نے فون بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹپک لگائی۔ میں سویرا اقبال جو میا نے ہزارے کی نجم ملی تھی۔ میں نے آج تک کسی کو انٹرویو نہیں دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب میری پہلی کتاب کو ہی آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔۔۔۔۔ اس لیے کہ میں پورا جی نہیں بول سکتی تھی اور آدھا جی ہمیشہ ٹیل کرتا ہے۔ یا پورا جی یا پورا جھوٹ۔

میں نے آج تک کسی اخبار یا رسالے کو انٹرویو نہیں دیا تھا اس لیے نہیں کہ خدا خواستہ میرا ماضی شرمناک تھا اور میرا پس منظر بتانے لائق نہیں تھا۔۔۔۔۔ جیسا کہ سراج الحق کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں سے

پتا نہیں انٹرویو دینے سے کیوں کتراتا ہیں۔۔۔۔۔ حالانکہ آپ اگر انٹرویو دیں گی تو آپ کی شہرت کو چار چاند لگ جائیں گے۔“ عرفان منیر نے بھی اٹھتے ہوئے کہا تو سراج نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے شاہا ش دی۔

”میرا خیال ہے جتنی شہرت اور عزت مجھے ملی ہے وہ میرے لیے کافی ہے اور شہرت حاصل کر کے میں کیا کروں گی، منیر صاحب۔“

”کوئی توجہ ہوگی، کیا فیملی پسند نہیں کرتی؟“ عرفان منیر کی آنکھیں جیسے مجھے اندر تک کھوج آنا چاہتی تھیں۔

”یہی سمجھ لیں۔“

سراج الحق کی آنکھیں، لمبے بھر کے لیے تسخیر اڑاتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ خوب سمجھتے ہیں ہم کہ تمہارے پس منظر میں ضرور کچھ کوئی گڑبڑ ہے۔

”دراصل اپنے پسندیدہ لوگوں کے متعلق سب کو ہی جاننے کا تجسس ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ان کا ماضی، خاندانی پس منظر سب کچھ۔۔۔۔۔“

”پچھلے سراج صاحب کبھی ان کا تجسس دور کر دیں گے۔ نی الحال تو۔۔۔۔۔“ میں نے کلائی موڑ کر پھر وقت دیکھا تو وہ دونوں حضرات خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئے۔ میں انٹرویو کیوں نہیں دیتی تھی اور میرا پس منظر کیا تھا۔ میں جانتی تھی سراج ہی نہیں کئی دوسرے بھی جاننا چاہتے تھے۔۔۔۔۔ اور یقیناً اندازہ لگاتے ہوں گے کہ میرے ماضی میں ضرور کچھ ایسا ہے جو بتانے لائق نہیں ہے۔

”منافق اور دوغٹے لوگ۔۔۔۔۔“ میں نے زیر لب۔۔۔۔۔ کہا اور ساڑھی کا پلو درست کیا۔

”لیکن کیا تم خود بھی منافق نہیں ہو۔“

میرے اندر سے آواز آئی لیکن میں نے اس آواز پر کان نہیں دھرے تھے۔ میں اپنے آپ کو منافق

شک جھٹکتا ہے، میرا ماضی دوسروں کے لیے شرمناک نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے میرے لیے ہو۔

میں میانے ہزارے کے ایک کسان دین محمد کے گھر پیدا ہوئی اور صوبیدار صابر حسین اور استانی بی کے گھر کی بی بی تھی۔ میرے حوالے میرا مان تو ہو سکتے تھے میری شرمندگی نہیں۔۔۔۔۔ تو میرا باپ میانے ہزارے کا کسان دین محمد تھا جو غریب تھا نہ امیر۔۔۔۔۔ بس اچھا گزارہ ہوتا تھا۔ پسینے، اوڑھنے، کھانے، پینے کو اچھا ملتا تھا۔۔۔۔۔ مجھ سے بڑی میری چار بہنیں اور ایک بھائی تھا۔۔۔۔۔ دو بہنیں بڑی تھیں پھر بھائی پھر دو بہنیں۔۔۔۔۔ میرا باپ ایک خاموش طبع اپنے کام میں مگن رہنے والا انسان تھا۔ اس نے بہنوں کی پیدائش پر دوا دیا کیونکہ مزید بیٹے کی خواہش کی تھی، یہ ماں تھیں جنہیں مزید ایک بیٹے کی خواہش تھی۔

”میرا ادنیال اکیلا ہے۔ ایک بیٹا اور ہو جائے

تو میرے دانو کا ہارو بن جائے۔ اس کا جوڑا۔۔۔۔۔ کلا (اکیلا) تو درخت بھی چنگا نہ لگدا۔۔۔۔۔ سو وہ دانی کے جوڑے کی خواہش میں مزار پر منت مانتی اور دیے جلاتی پھرتی تھیں اور دانی کے ہارو کے بجائے میں آگئی۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے مجھے دیکھ کر اماں نے نفرت سے منہ پھریا ہوگا۔ مزید بیٹے کی خواہش میں اوپر تلے تین بیٹیاں تو آچکی تھیں۔ پتا نہیں میرے بعد اماں کے دل میں بیٹے کی خواہش مری تھی یا نہیں لیکن میرے بعد گھر کی فزنی میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ میں چھ سال کی ہو گئی تھی۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی، سنا ہے چھوٹے بچے سے سب کو بہت پیار ہوتا ہے لیکن مجھے کبھی ایسا نہیں لگا تھا کہ میں گھر میں سب کی پیاری ہوں۔ اب شام کو تھکا ہارا کھیتوں سے آتا تو اس کے پاس اپنی اولاد کے لیے کوئی محبت بھری نظر یا بول نہیں ہوتے تھے۔ وہ اکثر مگن یا برا آدمے میں چھپی چار پائی پر بیٹھ جاتا، میری بڑی بہن شانو اس کے لیے حقدارہ کر کے لاتی۔ اماں چنگیر میں روٹیاں

اور سالن کی کٹوری رکھ کر چار پائی پر رکھ دیتی۔۔۔۔۔ ہمارے ہاں رات کا کھانا سر شام ہی کھالیا جاتا بلکہ دیہاتوں میں اکثر گھروں میں کھانا اب بھی سر شام ہی کھالیا جاتا ہے۔ اماں بھی کھانا کھا کر اور حقہ پی کر چار پائی پر لیٹ جاتا۔ دوسرے نمبر والی بہن عاشو، اماں کے پاؤں دپائی اور ابا دانی سے دو چار ہاتھیں کر کے سو جاتا۔ میں اماں کی چار پائی کے گرد منڈلاتی رہتی کہ اماں مجھے گود میں اٹھائے، چار پائی پر پاس بٹھائے اور کھانا کھاتے ہوئے میرے منہ میں بھی نوالے بٹا بنا کر ڈالے۔ پتا نہیں یہ کیسی حسرت تھی جو چھ سال کی عمر میں بھی دل کے اندر کبھی چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔۔۔۔۔ شاید میں تب سے ہی بہت گہرائی سے سوچنے لگی تھی۔ ابا تو ایک طرف اماں نے بھی میری طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ شانو اور عاشو ہی مجھے تھلاتی، دھلاتی اور کپڑے پہنائی تھیں۔ شاید پیدا ہوتے ہی انہوں نے مجھے تنہا لیا تھا۔ اماں نے صرف دودھ پلانے کا کام کیا تھا۔ ورنہ انہیں تو جب بھی موقع ملتا ایک آدھ دھمو کا جڑ دیتیں۔۔۔۔۔ میں گود میں جانے کو بھگتی تو دھکیل دیتیں۔

”چل پیچھے ہٹ نامراد۔۔۔۔۔“

پتا نہیں نامراد میں تھی یا میری آمد سے وہ نامراد رہ گئی تھیں کہ وہ وجہ بلا وجہ مجھے ایک دو تھپڑ لگا دیتیں۔۔۔۔۔ چھ سال کی عمر میں شاید کوئی اتنا حساس نہیں ہوتا ہوگا جتنا میں تھی۔۔۔۔۔ تھپڑ کھا کر بھی انہی کی طرف لپکتی۔۔۔۔۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے انہیں بتاتی کہ وہ مجھے بھی گود میں لے کر میرا ماتھا اور رخسار چومیں جیسے دانی کے چومتی ہیں بلکہ مجھ سے بڑی چو کو بھی اماں کبھی کبھار چوم لیتیں۔ جب وہ میٹر میوں سے گری تھی تب اور جب اسے بخار ہوا تھا تب۔۔۔۔۔ میں نے دیکھا تھا۔ اماں بار بار اسے پیار کر دیتی تھیں۔ تب میں بھی میٹر میوں سے گر گئی۔ پتا نہیں جان بوجھ کر گری تھی یا خود ہی گر گئی تھی شعور میں نہیں

اگے عمر کے بعد

ہیں کر میرے بازو پر لگایا۔ میں ان کی گود میں سکتی رہی..... استانی جی نے تاسف بھری نظروں سے اماں کو دیکھا۔

”اگر پیار و محبت سے اولاد کو پال نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو؟“ استانی جی کو بہت غصہ آ رہا تھا۔

”چار تھوڑی تھیں میری جان کو مجھے کب شوق تھا استانی جی اس کا، میں نے تو اللہ سے دانی کے لیے بھائی مانگا تھا۔ یہ فک پڑی۔“ اماں کے دل کی بات زبان پر آ گئی تھی۔

اگرچہ میری عمر صرف چھ سال کی تھی لیکن مجھے اس دن کا واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ شاید اس لیے کہ استانی جی اکثر اس دن کی بات دہرائی کرتیں..... جیسی وہ میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی..... اماں، بابا کے گھر کی یہ آخری یاد تھی اس لیے کہ اس روز استانی جی نے مجھے اماں سے مانگ لیا تھا۔ میں نے اکثر سوچا کہ جب اس گھر میں میری کسی کو چاہ نہیں تھی تو پھر اللہ میاں نے مجھے اس گھر میں کیوں پیدا کیا تھا وہ مجھے کہیں کسی اور گھر میں بھی تو پیدا کر سکتا تھا..... استانی جی نے مجھے اماں سے مانگا تھا اس لیے نہیں کہ وہ بے اولاد تھیں..... بلکہ اس لیے کہ انہیں مجھ پر ترس آ گیا تھا۔ ورنہ ان کے تین بیٹے تو پہلے سے ہی تھے۔

”لے جاؤ جی.....“ اماں ابھی تک دانی کے بال سہلا رہی تھیں اور انہوں نے اتنی بے پروائی سے کہا تھا جیسے میں کوئی شے تھی، جیسی جاگتی انسان نہیں اور جیسے میری پیدائش پر اماں نے کوئی تکلیف نہیں سہی ہوگی۔ یہ بات بھی استانی جی نے کئی بار ہی دہرائی تھی۔ سو حافظے میں اسی طرح موجود ہے، انہی الفاظ کے ساتھ۔

”اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی زرینہ، تو فکر نہ کرنا۔“ استانی جی اپنی طرف سے اماں کو تسلی دے رہی تھیں لیکن اماں کو بھلا اس کی پروا کیا ہو سکتی تھی کہ

ہے لیکن گرنے کے بعد آس سے اماں کی طرف دیکھا ضرور تھا کہ وہ مجھے بھی چو کی طرح پیار کریں گی لیکن اماں نے الٹا مجھے ایک پھنر چڑوایا۔

”تو چھت پر کیا کرتے گئی تھی؟“ ہاں شانو نے مجھے ضرور گود میں اٹھالیا تھا اور ہمدردی سے میری جوت سہلانے لگی تھی۔ میں حلق پھاڑ، پھاڑ کر روئی تھی لیکن اماں فس سے مس نہیں ہوئی تھیں اور آرام سے بیٹھی دانی کے گرتے پر پھول کاڑھتی رہیں..... اور یہ اس سے دو روز بعد کی بات ہے..... اماں گھن میں مٹی کے چولہے کے پاس بیٹھی تھیں۔ لکڑیاں کیلی تھیں اور سارے گھر میں دھواں بھرا تھا اور پھونکنی سے پھونکے مارتے، مارتے اماں کی سانس چھڑی گئی اور دھوئیں سے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کہ دانی روتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

”ارے کیا ہوا میرے لال۔۔۔؟“ اماں نے کلیجے پر ہاتھ رکھا اور دانی رو، رو کرتے لگا کہ چلے اسے غسل نے مارا اور پھر اس کا بھائی غسل بھی آگیا اور وہ بھی مارنے لگا..... شاید اماں کا زخم تازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک آہ بھری۔

”ہائے میرا دانتو نکلا (اکیلا) بارا گیا۔“ اور تب ہی میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا..... شاید میں پوچھنا چاہتی کہ بھائی کیوں درور ہا ہے۔

”اماں.....؟“ اور اماں نے چولہے سے لکڑی کھینچ کر میرے بازو پر دے ماری۔ سکتی لکڑی نے میری نازک جلد کو جلا دیا، میں چیخ چیخ کر رونے لگی تھی اس وقت جب اماں نے چولہے سے لکڑی کھینچی تھی تو استانی جی ہمارے گھر کے اندر داخل ہو رہی تھیں، انہوں نے بھاگ کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

”ہائے غضب زرینہ، یہ اتنی معصوم بچی کے ساتھ اتنا ظلم.....؟“

اماں بیزار سی لے بڑنگے دانی کو گود میں سٹائے بیٹھی رہیں اور استانی جی نے شانو سے کہہ کر کچا آلو

لس کو اپنے اندر اٹارنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔
جس روز استانی جی مجھے لینے آئی تھیں، میری چاروں بہنیں اور اکلوتا بھائی قطار بنا کر کھڑے مجھے جاتے ہوئے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کبھی، کبھی محن میں کھڑے ہو کر کبھی کبھار گزرنے والے جہاز کو دیکھتے تھے، حیرت سے اور خوشی سے۔۔۔۔۔ پتا نہیں ان کی آنکھوں میں حیرت بھری خوشی تھی یا حیرت بھرا دکھ۔۔۔۔۔ لیکن وہ سب اس وقت تک محن میں کھڑے رہے جب تک میں دروازے سے باہر نہ نکل گئی۔۔۔۔۔ اور ابھی ہم اپنی گلی میں ہی تھے کہ عاشر دوڑتی ہوئی آئی تھی اس کے ہاتھ میں پٹے کی چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔

”استانی جی! استانی جی!“

استانی جی رک کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

”یہ پانی کے پٹرے اماں نے دیے ہیں۔“
میں نے حیرت سے عاشر کی طرف دیکھا تھا۔
بھلا اماں نے میرے پٹرے کیوں بھیج دیے ہیں لیکن میرے ننھے سے دماغ میں یہ بات نہیں آسکی تھی کہ اس گھر سے میرا رابطہ ختم ہو رہا ہے۔ استانی جی نے گٹھڑی پکڑ لی تو عاشر کے جی میں پتا نہیں کیا آئی کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس پر پیار کیا اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔ میں جب اس منظر کو سوچتی ہوں تو میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر عاشر کے گیلے، گیلے ہونٹوں کا لمس جاگ اٹتا ہے اور میرا دل جیسے پھل کر پانی ہونے لگتا ہے۔ پتا نہیں کیوں۔۔۔۔۔ کبھی، کبھی تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں مار مار کر روؤں۔۔۔۔۔ اور ایسے میں خود ہی اپنے ہاتھ کی پشت کو چوم، چوم کر تھک جاتی ہوں۔

استانی جی میاں ہزارے کے پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھیں اور ان کے شوہر آدمی میں صوبیدار تھے اور چھٹیوں میں ہی گھر آتے تھے۔ استانی جی کا گھر ہمارے گھر سے صرف ایک گلی کے فاصلے پر تھا۔ جس وقت میں استانی جی کی انگلی پکڑے اپنے گھر

وہ مجھے اچھی طرح دیکھیں گی یا بُری طرح۔۔۔۔۔ میں تو تھی ہی بے طلب۔۔۔۔۔ ان چاہی۔۔۔۔۔ انہیں اگر ٹکڑی تو صرف یہ کہ برادری والے نہیں ہاتھ نہ بتائیں کہ اپنی بیٹی بھاری پڑ گئی تو دوسروں کو دے دی۔۔۔۔۔ پھر بھی انہوں نے استانی جی سے وعدہ کر لیا کہ وہ میرے ابا سے بات کریں گی اگر ابا نے اجازت دے دی تو بھلے استانی جی لے جائیں۔۔۔۔۔ ابا نے اماں کی بات سن کر حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

”ارے پانچ بیٹیاں ہیں تو کیا۔۔۔۔۔ ہم انہیں ہانٹنے لگیں۔۔۔۔۔؟“

”یہ دیکھو گلی پیچھے ہی تو استانی جی کا گھر ہے، شانو کے ابا۔۔۔۔۔ بہت پیار کرتی ہیں وہ اپنی ہالی سے۔۔۔۔۔ ان کے پاس رہے گی تو پڑھ لکھ بھی جائے گی۔۔۔۔۔ دیکھتے نہیں ہو کتنا شوق ہے اسے پڑھنے کا، کوئلے سے دیواریں کالی کرتی رہتی ہے، دانی کی کتابیں اور کاپیاں اٹھائے پھرتی ہے۔“

”سوچ لے، زربینہ شریک پائیں کریں گے۔“
ابا کو بھی اماں: ابی ٹکڑا من گیر ہو گئی تھی۔

”شریکوں کی پروا کر لی ہے میری جوتی۔“
اماں فیصلہ کر چکی تھیں تو ابا بھٹا کیا کرتے۔ اس روز پہلی اور شاید آخری بار ابا نے مجھے اپنے پاس بلا کر غور سے دیکھا۔

”تو استانی جی کے ساتھ ان کے گھر جائے گی؟“
میں نے سر ہلا دیا۔

”اچھا اگر ادھر دل نہ لگا تو گھر آ جانا۔“
میں نے پھر سر ہلا دیا اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ مجھے ہمیشہ کے لیے اس گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ میں اس گھر میں کسی کو مطلوب نہیں تھی۔

ابا کی دو انگلیوں نے پہلی بار نرمی سے میرے رخسار کو چھوا۔ ابا کی انگلیوں کا کھر در لمس آج بھی کبھی، کبھی مجھے اپنے رخسار پر محسوس ہوتا ہے اور میں کتنی ہی دیر اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس

آگے عمر کے بعد

شاید میں سویرا اقبال کی طرح کامیاب عورت نہ ہوتی لیکن سویرا اقبال سے زیادہ مطمئن ہوتی۔۔۔ لیکن استانی جی نے ایسا کچھ نہیں پوچھا تھا اور میں خود سے انہیں نہیں کہہ سکتی تھی کہ مجھے اپنا گھریلو آرہا ہے، مجھے دائیں بھجوا دیں، بھلے میں وہاں مطلوب نہیں تھی، اماں! بابا نے میرے ہونے کی دعائیں نہیں مانگی تھیں لیکن وہ میرا اپنا گھر تھا اور استانی جی کا گھر میرا نہیں تھا۔۔۔ میں آس بھری نظروں سے استانی جی کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید اب، شاید اب وہ پوچھیں۔۔۔ لیکن انہوں نے کار نہیں سے لائین اتار کر اس کی نوچے کی پھر اس کا شیشہ اونچا کر کے پھونک ماری۔۔۔ کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ ان دونوں مہمانے ہزارے میں بجلی نہیں تھی۔ پتا نہیں اب ہو۔۔۔ یا ہو سکتا ہے نہ ہو۔۔۔

کمرے میں اندھیرا ہو گیا تو میں بے آواز رونے لگی اور پھر روتے، روتے سو گئی۔

استانی جی نے اگلے دن بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ کیا مجھے گھر واپس جانا ہے، بہن، بھائی تو نہیں یاد آرہے۔۔۔ بلکہ انہوں نے کبھی نہیں پوچھا۔ انہوں نے بھی شاید مجھے کوئی چیز ہی سمجھا تھا جیسا کہ وہ دوسروں سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا کرتی تھیں۔

”اس کی ماں نے تو اسے یوں میری جھولی میں ڈال دیا جیسے اس نے درد نہیں ہے تھے۔ جیسے یہ کوئی چیز تھی اور اس نے نو ماہ پیٹ میں نہیں رکھا اس کا بوجھ نہیں اٹھایا۔۔۔“ آخر اماں اور استانی جی میں فرق ہی کیا تھا۔ انہوں نے بھی تو کبھی نہیں پوچھا۔

”کیا تمہیں اپنے سگ کھیلنے والی بہنیں یاد آتی ہیں؟ وہ اکلوتا بھائی، ملاؤ لا بھائی۔۔۔ اماں! اماں۔۔۔“ استانی جی کئی دن تک میرے بازو پر مرہم لگاتی رہیں۔ میرا زخم ٹھیک ہو گیا۔ حتیٰ کہ جلنے کا داغ بھی نہیں رہا لیکن دل پر جو آبلے پڑے تھے وہ آج تک خون پرستے ہیں اور وہ اسی طرح تکلیف دیتے ہیں۔

کے دروازے سے نکلی تھی تو مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ ایک گلی کا قاصد میرے لیے اتنا طویل ہو جائے گا کہ میں اسے کبھی ملے نہیں کر پاؤں گی۔ استانی جی نے گھر لاتے ہی سب سے پہلے میرے بازو کی طرف توجہ دی تھی۔۔۔ اور بڑے بیٹے کو دوایتیوں والی دکان پر بھیج کر مرہم منگوا کر میرے بازو پر لگایا تھا جس میں اب بھی جلن ہو رہی تھی۔۔۔ جب رات ہوئی تو میں نے سوچا ابھی استانی جی مجھے گھر چھوڑ آئیں گی لیکن استانی جی نے مجھے کمرے میں سونے کے لیے کہا۔ اس کمرے میں تین چار پائیاں تھیں ایک پر استانی جی سو رہی تھیں اور ایک پر انہوں نے مجھے سلا یا تھا۔ جبکہ تیسری چار پائی پر ان کا چھوٹا بیٹا سو رہا تھا جو مجھ سے تھوڑا سا بڑا ہو گا۔۔۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سات سال کا ہے اور تھری کلاس میں پڑھتا ہے۔ دونوں بڑے بیٹے ساتھ والے کمرے میں سو رہے تھے۔ میں چپ چاپ لیٹ گئی تھی لیکن میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں دوڑتی ہوئی اپنے گھر چلی جاؤں اور چکے سے جا کر عاشو یا شانو کی چار پائی پر ان سے چٹ کر سو جاؤں۔ گھر میں اکیلے تو میں کبھی نہیں سوئی تھی۔ اپنی چاروں بہنوں میں سے کسی ایک کے پاس سو جاتی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ جب استانی جی لائین بجھانے کے لیے اٹھیں تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

”سو جاؤ گڑیا۔۔۔“ اور پھر ان کی نظر شاید میری بھری ہوئی آنکھوں پر پڑی تھی۔

”کیا بازو میں جلن ہو رہی ہے۔۔۔ درد تو نہیں ہو رہا؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ کاش وہ پوچھتیں کہ اماں! بابا یاد آرہے ہیں یا گھر اور بہنیں یاد آرہی ہیں تو میں فوراً کہتی ہوں۔۔۔ اور پھر شاید زندگی مختلف ہوتی میں سویرا اقبال کے بجائے صرف اقبال ہوتی۔۔۔ دین محمد زبیر کی بیٹی۔۔۔

اور یہ باری سے میری دوستی کی ابتدا تھی۔
میرے آنسو گھم گئے تھے۔ وہ کچھ دیر مجھ سے
باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی عمر
سات سال ہے۔

استانی جی انکل کے آنے سے تھوڑی مصروف
ہو گئی تھیں۔ میں برآمدے میں بیٹھی رہتی۔ کئی بار میرا
جی چاہا کہ گھر چلی جاؤں۔ ابا نے کہا تھا کہ جی نہ لگے
تو آ جانا..... لیکن پتا نہیں کیوں میں وہ ایک گل پارٹ
کر سکی..... بس منتظر رہی کہ کوئی مجھے لینے
آئے..... لیکن کوئی نہیں آیا..... پتا نہیں میری گھنٹی
میں ہی آیا اور خود باری تھی کہ میں خود نہیں گئی۔

انکل واپس چلے گئے تو استانی جی نے میرا
یو نیفارم سٹوایا۔ ٹیلا فراک، سفید شلوار اور کالے بوٹ
پہن کر جب میں پہلے دن استانی جی کے ساتھ اسکول
گئی تو مجھے بہت اچھا لگا۔ اپنا آپ بھی اور اسکول جانا
بھی..... استانی جی نے مجھے پہلی جماعت میں داخل
کر دیا تھا..... میرا بڑا جی چاہ رہا تھا کہ میری بہنوں
میں سے کوئی آ جائے تو میں انہیں اپنا یو نیفارم دکھاؤں
اور شانو، عاشو دونوں ہی اسی روز استانی جی کے گھر
آئی تھیں اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ سب نانی سے
ملنے چنیوٹ گئے ہوئے تھے۔ کیا تھا اگر وہ مجھے بھی
ساتھ لے جاتے میں اپنے ہوش میں کبھی نانی کے گھر
نہیں گئی تھی۔ میرے دل میں جیسے ایک اور آبلہ پڑ گیا
تھا۔ میں نے شانو اور عاشو کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ بس
چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔ شانو نے مجھے
بتایا کہ نانی نے اماں کو بہت ڈانٹا ہے کہ انہوں نے
مجھے استانی جی کے ساتھ کیوں جانے دیا۔

”تو گھر چلے گی بانی؟“ عاشو نے مجھ سے کہا تو
میں استانی جی کی طرف دیکھنے لگی۔

”نہ بھائی بھول جاؤ اسے..... یہ تو اب میری
بچی ہے۔ تمہاری اماں نے اسے مجھ سے دیا ہے۔“
میں نیچے دیکھنے لگی اور کہہ نہ سکی کہ نہیں میں

مجھے استانی جی کے گھر آئے تیسرا دن تھا۔
جب استانی جی کے شوہر چھٹی پر گھر آئے تھے اور
استانی جی نے میرا ہاتھ پکڑ کر انہیں دکھایا تھا۔

”ایسی ظالم ماں جلتی لکڑی دے ماری معصوم
بچی کو..... میں تو لے آئی اسے کہ مجھے دے دو.....
ہمیں ایک بچی بھاری نہیں ہے جہاں تین بچے رہے
ہیں وہاں یہ بھی بچہ جائے گی۔“

”ہاں اچھا کیا..... ویسے بھی تمہیں بچی کا شوق
تھا۔ پورا ہو جائے گا۔“ صوبیدار انکل کو کوئی اعتراض
نہیں ہوا۔

استانی جی کے شوہر جنہیں میں بعد میں انکل
کہنے لگی تھی۔ دو تین دن کی چھٹی پر گھر آئے تھے اور
ان کے آنے کے بعد استانی دوسرے کمرے میں چلی
گئی تھیں۔ ایرار اور میں کمرے میں اکیلے تھے۔
رات کو جب استانی جی لائین بجھا کر چلی گئیں تو میں
چپکے چپکے رونے لگی..... تب ایرار جسے استانی جی اور
اس کے دونوں بڑے بھائی باری کہتے تھے۔ اپنی چار
پائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا..... باہر برآمدے میں بستی
ہوئی لائین کی مدھم، مدھم سی روشنی اندر کمرے میں
بھی آ رہی تھی۔

”تم کیوں رو رہی ہو گزلیا.....؟“ میں نے
جواب نہیں دیا تو وہ اپنی چار پائی سے اٹھ کر میری...
چار پائی کے قریب آ گیا۔

”ڈر لگ رہا ہے؟“

میں اور زیادہ رونے لگی۔

”ڈرو نہیں.....“ اس نے مجھے تسلی دی۔

”میں ہوں ناں ادھر..... اور تمہیں آیت

الکری آتی ہے؟“

”نہیں.....“ میں نے غمی میں سر ہلایا۔

”مجھے آتی ہے..... اماں کہتی ہیں آیت الکری

پڑھ کر سوئیں تو پھر ڈر نہیں لگتا..... میں پڑھ کر پھونک
دیتا ہوں۔“

اُنکے عمر کے بعد

ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی اپنی گلی میں چلی جاؤں اور اپنے گھر پہنچ جاؤں..... لیکن میں کبھی ایسا نہیں کر سکی۔ ہاں میری آنکھیں ضرور اپنی گلی کی طرف گمراہ ہو جاتیں..... استانی جی کی زندگی میں اور گھر میں بڑی ترتیب تھی۔ ہر کام گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ترتیب سے ہوتا تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر استانی جی ہمیں قرآن پاک پڑھاتیں، بڑے دلوں بھائی خود ہی پڑھ لیتے پھر ناشتا، ناشتے کے بعد اسکول اسکول سے آکر کھانا اور پھر آرام کرنا شام کو پھر اسکول کی پڑھائی..... لیکن مجھے اماں کے گھر کی..... بے ترتیبی یاد آتی۔ جب جی چاہا کھیلا..... جب جی چاہا لیٹ گئے۔ دوپہر میں چو اور فرد گڑیا لے کر بیٹھ جاتیں..... عاشو اور شانوان کے کپڑوں پر ستارے ٹانگ دیتیں۔ میں بھی پاس بیٹھ کر دیکھتی۔ کبھی محن میں سب مل کر کھیلتیں۔ انا بھی ڈالتیں، چھین چھپائی چل دوڑ اور ڈھیروں کھیل تھے..... اماں چارپائی بھی سیدھی کھڑی کر کے گرمیوں کی دوپہروں میں اس پر ازار بند ہوتیں..... ان کے ہاتھ بڑی تیزی سے ہاتس کی تیلیوں پر چلتے تھے۔ کوئی تیلیاں لگاتیں، کوئی لگاتیں، ڈیزائن بناتا جاتا۔ ایک بار میں نے تیلیاں کھینچ دی تھیں تو اماں نے مجھے کئی تھپڑ لگائے تھے۔ اماں کا پیار تو مجھے یاد نہیں تھا لیکن ان کی مار بھی مجھے یاد آتی تھی۔ مجھے اپنا گھر بھی یاد آتا تھا۔ جس کے محن کے ایک کونے میں ایلوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا، سوکھنے کے لیے اور ایک کونے میں لکڑیاں ہوتی تھیں جو ابا..... مال سے انٹھسی لے کر آتے تھے اور جب کبھی بادل آتے اور بارش شروع ہوتی تو سب بہنیں اور بھائی بھاگ، بھاگ کر یہ لکڑیاں اور آپے چھپڑتے رکھتے..... استانی جی کے ہاں مٹی کے تیل کا چولہا تھا جو برآمدے میں ایک کونے میں پڑا رہتا..... پاس ہی مٹی کے تیل کا ستر تھا جس میں سے بہو (پب) سے تیل نکال کر بوتل میں ڈالا جاتا اور کیف رکھ کر

اپنے اماں، ابا کی بیٹی ہوں اور مجھے گھر جانا ہے اور میں کبھی دل کی کوئی بات نہیں کہہ سکی تھی۔ کبھی اماں سے نہ کہہ سکی کہ مجھے اپنی گود میں لٹالیں..... کبھی ابا سے نہیں کہا کہ مجھے بھی انگلی پکڑ کر بازار لے جائیں۔ بس گھر گھر نہیں دیکھا کرتی اور دل میں خواہش اور لحظ بنتی رہتی۔

شانوان، عاشو اور دوسری بہنیں کبھی، کبھی مجھے ملنے آتی تھیں۔ عاشو نے ایک روز مجھ سے کہا تھا۔
"بالی چل گھر، میں نے تیرے لیے کپڑے کی اتنی اچھی کڑیاں بنائی ہے اور اماں کے پراندے سے دھاگے کال کر اس کے بال بھی بنائے ہیں..... اور آنکھیں بھی۔"

میرا بڑا جی چاہا کہ عاشو کے ساتھ گھر چلی جاؤں۔ اماں، ابا سب کو دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اماں شاید چو لھے پر ہانڈی چڑھائے بیٹھی ہوں مجھے اتنے دلوں بعد دیکھ کر ضرور مجھے گلے لگا کر چوم لیں گی اور کہیں گی بس اب تو نے نہیں جانا..... میں نے چپکے، چپکے استانی جی کی طرف دیکھا جو میری تنقید پر اکرے (نقٹے) ڈال رہی تھیں۔ جن پر مجھے سبایا اور قلم پھیرنا تھا..... اور مجھے یاد آیا استانی جی کہتی ہیں کہ مجھے اماں نے انہیں دے دیا ہے اور اگر میں چلی گئی عاشو کے ساتھ تو استانی جی تو ضرور کہیں گی اماں نے تھوک کر چاٹ لیا ہے پھر تو اماں کی بہت بے عزتی ہوگی۔ پہلے ہی استانی جی اماں کو قصاب اور ظالم کہتی ہیں..... تو میں عاشو کے ساتھ نہیں گئی..... جب میں نیلی فرائک سفید شلوار اور کالے بوٹ پہن کر اسکول جاتی تو مجھے لگتا جیسے میں عاشو، چو سب سے مختلف ہوں۔ جیسے میرے پر لگ گئے ہوں۔

استانی جی مجھے اپنے ساتھ اسکول لے کر جاتی تھیں اور ساتھ ہی واپس لاتی تھیں..... اپنے گھر والی گلی کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے قدم سست پڑ جاتے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں استانی جی کا

لیکن شاید میرے گھر سے آنے کے بعد اماں نے پھر دانی کے لیے جوڑے کی خواہش دل میں پال لی تھی کہ ایک دن بڑے دنوں بعد فرو آئی تو اس نے استانی جی کو بتایا کہ ان کے گھر بھائی آیا ہے۔

”اماں بہت خوش ہوں گی کہ اب دانی کلا (اکیلا) نہیں رہا تھا۔“ میں نے سوچا تھا۔ میرا دل اسے دیکھنے کو چاہ رہا تھا اور میں بار بار فرد کو دیکھتی تھی کہ وہ مجھے ساتھ لے جائے گی۔ بھائی دکھانے کے لیے لیکن وہ تو استانی کو بتا دے کر چلی گئی تھی۔ اسے اور گھروں میں بھی بتا دے ہائے تھے۔ اس روز استانی جی بھائی کی مہارک بادوسے گئیں تو مجھے ساتھ لے گئیں۔ اور میں اپنے ہی گھر کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ بڑے سے محسن کے گھر میں رکھے ایلوں کے ذخیرہ کو پھت کی طرف جاتی میٹھیوں کو شانو محسن میں چھلے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ وہ لوں گھروں میں زندگی کتنی مختلف تھی۔ استانی جی نے ساتھ میں اماں کے پاس کمرے میں آئی تھی۔ وہ چار پائی پر لیٹی تھیں اور ان کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ عاشوان کی چار پائی پر بیٹھی ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ دوسری چار پائی پر فرد سنے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اماں نے ہمیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

”ارے، ارے لیٹی رہو زریہ۔“ استانی جی نے کہا تھا لیکن اماں پھر بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ہا نہیں کیوں مجھے وہم سا ہوا تھا کہ میری طرف دیکھتے ہوئے اماں کی آنکھوں میں نمی تھی اور انہوں نے۔ بے اختیار ہاتھ آگے کیے تھے اور پھر پیچھے کر لیے تھے۔ میں دوڑ کر اماں سے لپٹ جانا چاہتی تھی۔ ان کی گود میں سا جانا چاہتی تھی لیکن اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ اس روز استانی جی نے مجھے گلابی جالی کا پھولا پھولا سا فراک پہنایا تھا جو صوبیدار انگل شہر سے میرے لیے لائے تھے۔ میں نے سفید جرابیں اور سفید ہی شوز پہن رکھے تھے۔ شاید استانی جی مجھے یہ

چھلے میں۔ محسن میں ایک طرف مٹی کا چولہا بھی تھا لیکن استانی جی اس چھلے پر صرف پانی گرم کرتی تھیں۔ اماں کے گھر کی بے ترتیبی میں بھی کتنا حسن اور خوب صورتی تھی۔ گرمیوں میں جب شام کے وقت اماں تندور جلا کر روٹیاں لگاتی تھیں تو میں پاس کھڑی انہیں دیکھا کرتی تھی پورے محسن میں گرم، گرم روٹی کی سوندھی، سوندھی خوشبو پھیل جاتی تھی۔ اماں کے گھر جب بھوک لگتی تھی شانو، عاشو چنگیری میں پڑی پچی روٹی پر اچار رکھ کر کھا لیتی تھیں لیکن استانی جی کے گھر میں کسی کو بے وقت کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ انصار اور ابصار بھائی تو ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے لیکن بادی میرے ساتھ کھیلتا تھا۔ اس نے اپنے سارے کھلونے مجھے دکھائے تھے۔ وہ عمر میں تو مجھ سے ایک سال ہی بڑا تھا لیکن پڑھائی کے لحاظ سے دو سال آگے تھا۔ میں سبق بھی یاد کر لیتی، کھیل بھی لیتی اور پھر بھی جیسے سارا دن میں فارغ بس استانی جی کے گھر کے برآمدوں اور کمروں میں گھومتی پھرتی۔ کئی بار دروازہ کھول کر دیکھتی۔ بس ایک گلی کا فاصلہ اور۔۔۔ شروع میں شانو، عاشو فرد تو کبھی بھی آ جاتی تھیں، تھوڑی دیر کے لیے لیکن اماں نہ جانے کیوں نہیں آتی تھیں۔۔۔ دانی کو بھی میں کبھی اسکل سے آتے جاتے گل میں دیکھ لیتی تھی لیکن اماں، ابا نہیں ملتے تھے۔ حالانکہ عاشو یا شانو جب بھی آتیں ضرور پوچھتی تھیں کہ مجھے گھر تو نہیں جانا اور اگر کبھی استانی جی من لیتیں تو ضرور ہاؤ کروا تیں کہ اب میں ان کی بیٹی ہوں۔۔۔ حالانکہ انہوں نے مجھے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں انہیں استانی جی نہ کہوں بادی اور انصار، ابصار کی طرح امی کہوں۔۔۔ نہ ہی مجھے یہ کہا کہ صوبیدار انگل کو ابو کہو۔ یوں میں ہمیشہ ہی انہیں استانی جی اور انگل کہتی رہی۔۔۔ میں پہلی سے دوسری میں آگئی۔ بہنوں کا آنا کم ہوتے، ہوتے ختم ہو گیا

الہ علیہ السلام

اجھا سا نام جو دانیال سے ملتا جلتا ہو۔" اماں کی آنکھیں یک دم لودینے لگی تھیں، میں نے نظریں ان کے چہرے سے ہٹالیں۔

میرا نام اماں نے اقبال رکھا تھا۔ اب سوچتی ہوں شاید اماں نے پہلے سے ہی دانیال کے ساتھ ملا کر سوچ رکھا ہوگا لیکن جب میں آگئی تو اماں نے میرا ہی نام اقبال رکھ دیا۔ لیکن جب استانی نے مجھے اسکول داخل کروایا تھا اور میڈیکل کیمٹی سے میرا پیدائش کا شواہد لکھوایا تھا تو اس میں میرا نام سویرا اقبال لکھا ہوا تھا۔ سو میرا پورا نام سویرا اقبال تھا۔ ضرور سویرا نام کا سابقہ شائع یا عاشو نے میرے نام کے ساتھ لگایا ہوگا اور ابا سے کہا ہوگا کہ یہی نام لکھوائیں۔ خود ان کے بھی تو دو، دو نام تھے۔ عاشو کا جانشین، عاشو کا رخسانہ جیہیں، چو کا پروین اختر اور فرد کا فریدہ زین۔ اس روز استانی جی ابا کے آئے تک رتی نہیں۔ ابا منہ ہاتھ دھو کر باہر برآمدے میں ہی چار پائی پر بیٹھ گئے تھے۔ فرد میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لائی تھی۔

"ابا دیکھیں کون آیا ہے۔"

ابا کی آنکھیں کچھ دیر کھیرے چہرے پر ٹپک گئی تھیں۔

"کیا ابا میری شکل بھول گئے ہیں؟"

"بڑھرا پالی۔۔۔۔۔" ابا حیرت کے سمندر سے باہر

آئے تھے۔ تو ٹھیک ہے ناں۔۔۔۔۔ خوش ہے ناں۔۔۔۔۔"

میں نے سر ہلا دیا تھا۔

"جی تو نہیں گھبراتا۔۔۔۔۔ گھبرائے تو گھر واپس

آ جانا۔" ابا نے اسی روز والی بات دہرائی تھی اور

میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے پھر وہم

ہوا تھا جیسے ابا کی آنکھیں پُر خم ہوں اور ان کا ہاتھ لرز

رہا ہو۔ میرا جی چاہا تھا کہ میں کہوں ہاں میرا جی گھبراتا

ہے، ابا مجھے گھر آنا ہے، مجھے نہیں جانا۔۔۔۔۔ لیکن

میں ہمیشہ کی طرح کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کاش میں رو

تی پڑتی، ابا سے لپٹ جاتی لیکن۔۔۔۔۔ میں تو یہ بھی

2014

نے کپڑے اس لیے پہنا کر لے گئی تھیں کہ اماں کو لگے کہ میں اس گھر کے مقابلے میں اس گھر میں زیادہ اچھی طرح اور زیادہ خوش ہوں۔۔۔۔۔ اچھی طرح تو تھی لیکن میں زیادہ خوش نہیں تھی اور یہ بات صرف میں جانتی تھی اور میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ میں بھی وہ بات نہ کہہ پاتی تھی جو میرے دل میں ہوتی تھی۔ میری بہنیں مجھے حیرت اور رشک سے دیکھتی تھیں اور مجھے اپنا آپ اس گھر میں بہت اچھی، اچھی سا لگتا تھا۔۔۔۔۔ فرو نے مجھے بھائی دکھانے کے لیے بلایا تھا۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا اور آنکھیں میچے سو رہا تھا۔ میں نے بہت ڈرتے، ڈرتے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر فوراً اٹھالیا تھا۔ فرو نے کہا تھا۔

"ہائے پالی تو ہوا نکل، شہری کڑی لگ رہی ہے۔" میں چپ، چپ ٹکا ہوں جھکائے بھائی کو دیکھتی رہی تھی۔ جیسے مجھے بولنا نہیں آتا تھا اور مجھے واقعی بولنا نہیں آتا تھا جب استانی جی جاری تھیں تو میرا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔۔۔۔۔ میں نے کئی بار الفاظ ترتیب دیے کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن کچھ نہ کہہ سکی۔۔۔۔۔ اور بے بسی سے فرو کو دیکھنے لگی۔

"تھوڑی دیر اور رک جائیں استانی جی، مٹا نو کے ابا آتے ہوں گے وہ جی پالی سے مل لیں گے۔ یاد کرتے ہیں۔" اماں لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

مجھے اماں کی بات کا یقین نہیں آیا تھا اگر ابا مجھے یاد کرتے تو ایک گلی کا قاصداں کا طویل تو نہیں تھا کہ استانی جی کے گھر تک نہ آسکتے۔ اماں اب، ہولے، ہولے کچھ کہہ رہی تھیں میں پھر منہ کو دیکھنے لگی۔

"اماں بہت بیمار ہو گئی تھیں پالی۔۔۔۔۔ بس مرتے، مرتے ہی ہیں۔" فرو نے مجھے بتایا تھا میں نے مڑ کر اماں کو دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھیں یا شاید فرو۔۔۔۔۔ فرو کو ہی دیکھ رہی ہوں گی۔

"نام کیا رکھا ہے؟" اب استانی جی نے پوچھا تھا۔

"ابھی تو کچھ نہیں رکھا۔۔۔۔۔ آپ بتائیں ناں

تو یہ آپ کی بیٹی ہے۔“ اماں، استانی جی سے بات کرتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

”پھر بھی بیٹی تو آپ کی بیٹی ہے ناں زریںہ بہن، میں نے سوچا پوچھ لوں یہ نہ کہیں کہ ہماری بیٹی کو لے کر غائب ہو گئے۔“ استانی جی مسکرائیں۔

”خوشی، غمی، عید، بقر عید تو اپنے گاؤں میں کریں گے ناں آپ لوگ؟“ اماں کی آواز میں جیسے حسرت سی تھی۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں..... عید، بقر عید تو اپنے گاؤں میں ہی کر لیتی تھی ہے۔“

میں ادھر کی بھی نہ ادھر کی..... استانی جی کی بیٹی تھی ناں اماں کی..... استانی جی کو مجھ سے بھردی تھی، ہمارے درمیان صرف ترس اور بھردی کا رشتہ تھا۔

اور اماں کو میری طلب نہیں تھی، میں بے طلب ہی ان کی جھولی میں آ گئی تھی..... مجھے محبت کی طلب تھی۔ جس کاتب مجھے اوداک نہیں تھا اور جب اوداک ہوا تو میرے اندر نا سورا ہو گئے تھے کہ میں

بہن چاہی تھی۔ ایک اور بیٹے کی آرزو میں اماں نے مجھے جنم دیا۔ میں جو پانچویں بیٹی تھی اور مجھ سے پہلے چار اور بھی تھیں۔ اس لیے اماں مجھے استانی جی کو

دے کر بھول گئیں۔ کھاریاں آکر استانی جی نے مجھے اور باری کو ایک ہی اسکول میں داخل کروایا تھا۔ میں کلاس تھری میں تھی تو وہ فائیو میں.....

یہاں پڑھائی تھوڑی مختلف اور مشکل تھی لیکن استانی جی نے میرے اور باری کے لیے ٹیوٹر رکھ لیا تھا۔ انصار بھائی اور انصار بھائی بھی اکیڈمی جاتے تھے۔

میں ذہین تھی بلکہ اسکول کی ٹیچرز نے ایک بار استانی جی سے پیرٹس میٹنگ پر کہا تھا کہ آپ کی بیٹی جینٹلنس ہے..... اور استانی نے فوراً تردید کی تھی۔

”نہیں میم، اللہ اس کے ماں، باپ کو زندہ رکھے۔ یہ میری بیٹی نہیں ہے بلکہ ہمارے گاؤں میں

نہیں کر سکتی تھی۔ چو کو کوئی بات اماں سے منوانی ہوتی تھی تو چیخ، چیخ کر رو دیتی تھی۔ زمین پر لیٹ کر لائیں چلاتی، بچل، بچل کر رو دیتی..... کاش جب استانی جی مجھے لینے آئی تھیں تو میں بھی زمین پر لیٹ جاتی۔ بچل، بچل کر پاؤں رگڑ، رگڑ کر رو دیتی اور لبا، اماں استانی جی کو منع کر دیتے لیکن نہ میں اس روز ایسا کر سکی تھی نہ

اب اور استانی جی کے ساتھ ان کے گھر آ گئی تھی۔ اس روز میں نے باری سے بھی بات نہیں کی تھی اور چپکے سے اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی تھی۔ حالانکہ باری نے کہا بھی تھا کہ لوڈ کھیلتے ہیں لیکن میں سوتی بن گئی تھی مجھے بہت روٹا آ رہا تھا اور پھر جب میں نے

دوسری پاس کر لی تھی تو انصار بھائی بھی ساتویں پاس کر کے آٹھویں میں آ گئے تھے اور صوبیدار انگل چاہتے تھے کہ اب وہ شہر کے کسی اچھے اسکول میں

پڑھے۔ چنانچہ استانی جی کھاریاں جانے کی تیاریاں کرنے لگی تھیں اور میں نے باری سے پوچھا تھا۔ ”اب تم سب لوگ شہر میں رہو گے؟“

تب باری نے مجھے بتایا تھا۔

”ہاں..... اور تم بھی تو ہمارے ساتھ جاؤ گی..... تمہاری اماں نے تمہیں میری امی کو جو دے دیا ہے۔“

اور میرا دل جیسے ڈوب گیا تھا۔ میری اماں، اما، شانو، عاشو، پو، فرو، دانی اور چھوٹا جمال جانے سے ایک دن پہلے استانی جی مجھے سب سے ملوانے کے لیے لے گئی تھیں۔ اس روز بھی انہوں نے مجھے عید والی نئی فرائک پہنائی تھی۔

”ہم لوگ کھاریاں جا رہے ہیں تاکہ بچوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھا سکیں۔ یوں تو آپ نے ہالی مجھے دے دی ہے پھر بھی آپ کی چیز ہے سوچا آپ سے اجازت لے لوں..... یہ آپ کی امانت ہے جب کہیں گے لے آؤں گی۔“

”استانی جی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ..... اب

232 ماہنامہ پاکیزہ اگست 2014

الـصـحـفـہ بعد

کہاں اس مختلف ادبی پرچوں میں چھپا کرتی تھیں۔ لیکن مجھے اس کا علم بہت بعد میں ہوا تھا کہ وہ رائٹر ہیں۔ ان کی عادت تھی۔ وہ لڑکیوں کو آؤٹ آف کورس چیزیں بھی لکھنے کو دیا کرتی تھیں تاکہ ان کی رائٹنگ پاور بہتر ہو جائے تو اس روز جب میں لکھنے بیٹھی تو میری آنکھوں کے سامنے اماں اور ابا آگئے تھے۔ میں نے لکھا..... میری اماں کو نہ میری طلب تھی نہ چاہ..... مجھے نہیں علم کہ میری اماں کی جب پہلی نظر مجھ پر پڑی ہوگی تو اس نظر میں میرے لیے کیا تھا؟ محبت یا نفرت..... میرا خیال ہے نفرت..... باراضی، غصہ..... میرے اندر جسے قہقہے پھل، پھل کر صبح پر گر رہے تھے..... اگلے روز مس رہانی نے میری کالی دیکھی اور پھر اپنے پاس ہی ٹیبل پر رکھ لی تھی۔ ہائی لڑکیوں کی کاپیاں انہوں نے واپس کر دی تھیں۔ میں نے ڈرتے، ڈرتے ان سے کاپی مانگی.....

انہوں نے بغور مجھے دیکھا۔

”تمہارا مضمون کافی لمبا ہے۔۔۔ بریک میں آفس میں آنا۔“

اس روز میرے اور مس رہانی کے درمیان ایک ایسے تعلق کی بنیاد پڑی تھی جو آج تک نہیں ٹوٹا..... اس روز انہوں نے میری انگلی تھام کر میری رہنمائی کا فریضہ سنبھال لیا تھا۔

”یہ تم نے خود لکھا ہے یا کہیں سے نقل کیا ہے؟“

”میں نے خود لکھا ہے۔“

میری آنکھوں میں میا نے ہزارے سے آنے کے بعد پہلی بار آنسو آئے تھے۔

”میرے پاس اپنے والدین پر لکھنے کے لیے یہی کچھ تھا۔“ اس روز استانی جی والی ڈیوٹی میں نے سنبھالی تھی اور مس رہانی کو دینی بتایا تھا جو استانی جی دوسروں کو بتاتی تھیں۔

”تمہاری تحریر بہت خوب صورت ہے، میرا

میرے بہت اچھے جاننے والے کی بیٹی ہے۔ پانچ بیٹیاں تھیں ان کی سو یہ ایک میں نے لے لی۔“ ٹیچر کی تعریف پر جو میرے اندر خوشی کے چراغ جلے تھے وہ یک دم بجھ گئے۔

یہ وہ جملہ تھا جو وہ اکثر بولا کرتی تھیں۔ جب تک میں ان کے ہاں رہی اس جملے نے سیکڑوں بار مجھے زخمی کیا..... جب بھی کوئی کہتا آپ کی بیٹی بہت خوب صورت ہے، بہت پیاری ہے، ذہین ہے، جواب میں وہ اسی طرح کی یا اس سے ملتی جلتی بات کہتی تھیں۔ یوں میں نہ اماں، ابا کو بھلا یا کی نہ استانی جی کو اپنا سکی۔ میں جیسے خلا میں تھی مگر میں زبان سے کچھ نہ کہہ پاتی حالانکہ میرا جی چاہتا تھا کہ ان سے کہوں مجھے میرے گھر واپس چھوڑ آئیں پر میرے اندر لفظ نپٹے اور بگڑتے اور پھر کہیں کھو جاتے تھے۔ میں اس گھر کی فرد ہوتے ہوئے بھی اس گھر کی فرد نہیں تھی۔ اور جس گھر کی فرد تھی انہوں نے مجھے اپنے گھر سے بے دخل کر دیا تھا..... کھارپاں سے جہلم، جہلم سے راول پٹھی ہمارا قیام کئی شہروں میں رہا لیکن ہم پھر کبھی میا نے ہزارے نہ گئے حالانکہ استانی جی نے اماں سے کہا تھا کہ ”عید، بقرعید تو اپنے گاؤں میں ہی چلتی ہے۔ اچھی شہروں میں کیسی عیدیں.....“

اور ہر عید سے پہلے میں جیسے آس لگا کر بیٹھ جاتی تھی کہ اب استانی جی کہیں گی کہ تیاری کر لو۔ عید کرنے کا ڈل جانا ہے۔ لیکن ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا..... کبھی..... انصار کے امتحان نزدیک ہوتے، کبھی ابصار کے، کبھی صوبیدار انکل کی چھٹی اتنی مختصر ہوتی کہ جانہ پاتے اور میرے اندر جو دکھوں کا شکوؤں کا ڈھیر لگا تھا ان میں ایک اور دکھ کا اضافہ ہو جاتا۔ پھر ان دکھوں نے لفظوں کا پیراہن پہن لیا..... میں چھٹی میں تھی جب ہماری اردو کی ٹیچر مس رہانی نے ہمیں اپنے والدین پر مضمون لکھنے کے لیے دیا..... مس رہانی ایک کہانی نگار تھیں۔ ان کی

دل کہتا ہے تم ایک دن بہت بڑی رائٹر بنو گی۔“ وہ مسکرائی تھیں۔

پھر انہوں نے مجھے بچوں کی کہانیاں پڑھنے کو دیں۔ وہ اخبار میں سے بچوں کا صفحہ میرے لیے لے کر آتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کہانی لکھنے پر اکسایا..... اور چھٹی جماعت میں ہی میں نے بچوں کے لیے کہانی لکھی اور مس ربانی کو دی جو انہوں نے بچوں کے ایک میگزین میں چھپوا دی۔ یوں یہ سلسلہ چل پڑا۔۔۔۔۔ پھر میں نے ساتویں میں نظم لکھی..... مائی مدر.....

مس ربانی نے اس کی تصحیح کر کے چھپوا دیا۔ پھر میں نے اردو میں بھی نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ مس ربانی نے ہر، ہر لمحہ مجھے گائیڈ کیا۔ میٹرک تک یہ راز صرف میرے اور مس ربانی کے درمیان رہا۔ میں نے باری کو بھی اس کے متعلق نہیں بتایا۔ جس کے ساتھ میں اب اکثر باتیں صبر کرنے لگی تھی لیکن اب بھی زیادہ وہ ہی بولتا تھا، میں تو صرف سنی تھی..... میں جب ناکتھ میں آئی تو وہ میٹرک کر کے کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ یوں اسکول کا ساتھ چھوٹ چکا تھا۔ اس نے میٹرک تک اسی اسکول میں پڑھا تھا جس میں ابھی میں پڑھ رہی تھی..... میں نے میٹرک میں پہلی غزل لکھی..... وہ کوئی خاص تو نہیں تھی اور اس کے ایک دو مصرعے بے وزن تھے لیکن ایک بار پھر مس ربانی میری راہرہ بن گئی تھیں۔

انہوں نے میری غزلوں کی اصلاح کی اور وہ ادبی پرچوں میں ان کے توسط سے چھپنے لگیں تو جب میں میٹرک میں گئی تو میں نے باری کو بھی اس راز میں شریک کر لیا تھا..... باری کو یقین نہیں آتا تھا۔

”یہ تم نہیں ہو سکتیں ویرا.....“ یہاں اس گھر میں مجھے ہالی کے بجائے سب سے پہلے باری نے ہی ویرا کہنا شروع کیا تھا اور پھر سب ہی ویرا کہنے لگے تھے۔ ”یہ میں ہوں، لیکن تم استانی جی کو مت بتانا.....“ ”اچھا اس جیسا ایک مصرعہ کہو۔ میرا مطلب

ہے مصرعہ طرح میں دیتا ہوں۔

ابھی، ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ”جوا“ ”جداغیوں میں توہل بھر گزرتا مشکل ہے ابھی، ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا جو شاخ جھک نہیں سکتی وہ ٹوٹ جاتی ہے سنبھل کے ہاتھ بڑھانا اگر جھکا ہوا“

”گریٹ۔۔۔۔۔ مجھے یقین نہیں آ رہا.....“ پھر روز تمہارے متعلق صحیح کہتی تھیں کہ تم جھٹکس ہو۔“ اس روز اس نے میری اب تک کی چھٹی ہر چیز دیکھی اور پڑھی تھی..... اور مجھے بے اندازہ سراہا تھا۔

اس روز پہلی بار مجھے اپنا آپ ٹھوڑا معتبر لگا تھا اور مجھے مس ربانی کی بات صحیح لگی تھی کہ اللہ اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے۔ اگر میں وہاں ہی ہوتی میا نے ہزارے میں اپنی اماں کے گھر تو شاید اس وقت میری زندگی کا رنگ مختلف ہوتا..... اور مجھے لگا جیسے دل میں نیچے دکھ کے کانٹے کی جھین کچھ کم ہو گئی ہے..... اور میں نے سوچا جب بھی ہم میا نے ہزارے جائیں گے تو اماں، بابا اور باقی سب مجھے دیکھ کر کس قدر حیران ہوں گے اور جب میں انہیں بتاؤں گی کہ میرا لکھا اخباروں اور رسالوں میں چھپتا ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا لیکن تب مجھے علم نہیں تھا کہ میں اب میا نے ہزارے کبھی نہیں جاؤں گی۔ جس روز انصار بھائی کی پاسنگ آؤٹ پر پڑی تھی اس روز کا کول سے واپسی پر استانی جی اور صوبیدار انکل میا نے ہزارے چلے گئے تھے۔ وہاں اپنا آبائی گھر اور زمین بیچ کر آئے تو سیالکوٹ میں اپنا گھر لے لیا اور باقی کی رقم بینک میں محفوظ کر دی۔ ان دنوں ہم سیالکوٹ میں رہ رہے تھے اور یہاں رہتے ہمیں پانچ سال ہو رہے تھے۔ اس لیے مستقل رہائش کے لیے بھی سیالکوٹ کو ہی منتخب کیا گیا تھا..... یوں بھی ابراہ، ابصار اور میں ہم تینوں ہی یہاں کے اسکول اور کالجز میں پڑھ رہے تھے۔ ابصار کا ارادہ بھی آرٹس میں

الہ عصر کے بعد

ایک بار پھر سردی ار میں مارا تھا۔ میرے ماتھے پر گوڑ
بن گیا تھا لیکن مجھے درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ
درد اس سے کہیں زیادہ تھا جو میرے اندر تھا۔

"مت کرو، ایسا دیرا۔" اس نے پریشان ہو کر
مجھے رد کا۔

پھر وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا۔
"کیا ہوا ہے، کیوں کر رہی ہو ایسا..... دیرا
مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔" اس نے میرے ہاتھ
تھام لیے۔

میری عمر سولہ سال تھی اور جو درد میرے دل
میں اترا تھا وہ مجھ سے سہا نہیں جا رہا تھا۔ میں
لاشعوری طور پر اس درد کو کم کرنے کے لیے جو اندر
وجود کو کاٹتا تھا..... خود کو تکلیف دے رہی تھی لیکن اندر
درد تو ایسا ہی تھا اور باہر کی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی
تھی..... اس روز باری نے جس طرح میرے درد کو
اور میری تکلیف کو محسوس کیا تھا اس سے میرے اور
باری کے درمیان ایک نئے رشتے کی بنیاد پڑی تھی۔
محبت کے رشتے کی..... لیکن تب میں اس بات سے
بے خبر تھی کہ میرے اور باری کے درمیان یہ کیسا
بندھن بندھا ہے۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے خالی
تھیں لیکن میرے قلم نے اس رات آنسو بہائے تھے
اور جب میں نے اپنی تخلیقات مس رہانی کو دکھائی
تھیں تو مس رہانی نے حیرت اور خوشی سے مجھے لگے
لگا لیا تھا۔

"تم ایک دن بڑا نام کماؤ گی سویرا۔" اور ایسا
ہی ہوا تھا۔ انیس سال کی عمر میں میرا پہلا مجموعہ کلام
تشنہ لب، جب منظر عام پر آیا تھا تو اسے جو پڑ پڑائی ملی
اس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا..... یہ سب مس رہانی
کی کوششوں سے ہوا تھا۔ مجھے تو کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے
تو بس اپنا سارا کلام اکٹھا کر کے انہیں دے دیا تھا۔
مس رہانی چاہتی تھیں کہ کتاب کی تقریب رونمائی ہو
اور میں بھی اس میں شرکت کروں لیکن میں نے منع

جانے کا تھا۔ البتہ اہلکار نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا تھا
کہ وہ کیا کرے گا۔ وہ ایف، ایس، سی کر رہا تھا۔

"تو اب میں کبھی میانے ہزارے نہیں جاسکوں
گی اور کبھی اپنے ماں، باپ کا گھر دوبارہ نہیں دیکھ
سکوں گی....." سب کے دھندلے دھندلے سے
چہرے میری آنکھوں کے سامنے آرہے تھے.....

میرے پندرہ سال سے جو آس کا دیا جل رہا تھا وہ
ایک دم بھڑک کر بجھ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں دھول
اڑ رہی تھی اور اندر جیسے گہرا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔

میں اس وقت اوپر چھت پر جانے والی بیڑھیوں پر
بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی مجھے استانی نے بتایا تھا
کہ انہوں نے میانے ہزارے والا گھر اور زمین بیچ
دی ہے اور انہوں نے بتایا تھا میرے گھر میں سب
بھلے چٹکے ہیں..... اور یہ کہ شانو اور عاشو دونوں کی

شادیاں ہو گئی ہیں۔ میں چڑیا کے بھوکے پیاسے بچوں
کی طرح متاٹھائے ان کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ابھی
وہ بتائیں گی کہ اماں مجھے یاد کرتی تھیں.....

او اس ہیں، میرا دیر دانی اور میرے ابا بھی مجھے بہت
یاد کرتے ہیں لیکن چڑیا کے بچے چوچ کھاتے بیٹھے
رہے اور چڑیا ان کی چوچ میں داندہ دنگا ڈالے بغیر اڑ
گئی۔ استانی جی ابصار کے ساتھ مکان دیکھنے چلی
گئیں۔ صوبیدار انکل ڈیوٹی پر تھے اور اہلکار چاہتے
کہاں تھا۔ میرے غم کی شدت اتنی تھی کہ میں ہولے،
ہولے بیڑھیوں کی دیوار کے ساتھ سر مارنے لگی۔

جب اہلکار گھر میں داخل ہوا تھا۔

"کتنی دفعہ کہا ہے دیرا..... جب امی وغیرہ گھر
پر نہیں ہوں تو دروازہ بند کر لیا کرو۔"

وہ مجھے دور سے ہی دیکھتا اور بولتا ہوا قریب آیا
تھا اور پھر مجھے دیوار کے ساتھ سر مارنے ہوئے دیکھ
کر گھبرا گیا تھا۔

"یہ، یہ کیا کر رہی ہو دیرا....." اس نے مجھے
رد کا..... میری آنکھوں میں وحشت تھی۔ میں نے

ملاقات کم، کم ہو پاتی تھی۔ ہاں فون پر رابطہ رہتا تھا..... ایک روز انہوں نے مجھے مشاعرے کا دعوت نامہ بھجوایا..... لیکن باری نے مجھے منع کر دیا۔

”تم مشاعرے میں نہیں جاؤ گی ویرا..... وہاں لوگ تمہارے سامنے واہ واہ کریں گے اور تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ذات پر تبصرہ کریں گے..... یہ لوگ خواتین شاعرات کے ساتھ فخر نہیں ہوتے..... عزت نہیں کرتے اور پھر خواہ مخواہ اسکیڈل بن جاتے ہیں۔“

”تم چاہتے ہو میں نہ لکھوں.....؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں..... میں ایسا نہیں چاہتا..... تم لکھو، تمہارے اندر ٹیلنٹ ہے اسے ضائع مت کرو لیکن مشاعروں اور فیروزہ میں شرکت نہیں کرو۔“

”فحیکہ یہ ہے.....“ میں نے دعوت نامہ بھاڑ دیا۔
اور پھر میں نے بھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ اندازے لگانے والوں نے اندازے لگائے۔ سو برا اقبال کسی کمزور و بیوقوف سے تعلق رکھتی ہے، وہ بد صورت ہے۔ نقاد میری تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے میری ذات کے متعلق کچھ نہ کچھ جملے لکھ دیتے تھے۔ کسی نے لکھا۔ میرا بیک گراؤ بڑا مشکوک ہے، شاید اس لیے میں نے آج تک انٹرویو نہیں دیا۔

کسی نے میرے ماضی کو شرمناک کہا۔ کسی نے کہا کہ سو برا اقبال فرضی کردار ہے، آپ پر وہ کوئی اور ہے لیکن مجھے ایک بڑی شاعرہ قرار دینے والوں کی بھی کمی نہیں تھی..... جو میری ذات کو الگ کر کے میری تحریر دیکھتے تھے.....

میری کتاب کو آدم جی ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ کئی دوسری تنظیموں نے بھی ایوارڈ دیے۔

میرے سب ایوارڈ مس ربانی نے ہی وصول کیے تھے۔ اکیس سال کی عمر میں میری دوسری کتاب ہجر بھی آگئی تھی۔ پہلی کتاب کے ان دو سالوں میں کئی ایڈیشنز چکے تھے اور میرے اندر عجب بے گلی ہی

کر دیا۔ میں بہت خوف زدہ تھی۔ ابھی تک استانی جی اور صوبیدار انگل نہیں جانتے تھے کہ میں نہ صرف شاعری کر رہی ہوں بلکہ میری ایک کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ان کا رد عمل کیا ہوگا..... ہو سکتا ہے انہیں یہ سب اچھا نہ لگے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا جب باری نے استانی جی اور انگل کو بتایا تو سب نے حیرت بھری خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”ارے، مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ میری بیٹی بہت جینکس ہے۔“ یہ استانی جی تھیں۔ میں چپ بیٹھی تھی۔
”ارے واہ..... ہماری بہنا تو ہمیں رستم نکل۔“

انصار بھائی بھی ان دنوں چھٹی پر آئے تھے۔ ان کی شادی کیا تیار یاں ہو رہی تھیں۔ انصار بھائی کی بھی ممکن ہو گئی تھی۔ انصار بھائی کی شادی کسی کرئل کی بیٹی سے ہو رہی تھی..... شادی میں سگی بہنوں کی طرح ہی مجھے نیگ ملے..... استانی جی نے ہر فنکشن کے لیے بہترین لباس تیار کروایا..... بلکہ شروع سے لے کر اب تک انہوں نے اچھا کھلایا، اچھا پہنایا، بہترین اداروں میں تعلیم دلوائی پھر بھی میرے اندر کیسی غلطی تھی اور کتنی پیاس تھی..... میرے اندر ہر وقت کن سن ہوتی رہتی تھی۔ میں کیا چاہتی تھی، کبھی تو مجھے سمجھ نہیں آتا تھا..... میں نے بھی خوشی کو خوشی کی طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر بھی محبت کی ایک کوئیل میرے اندر پھوٹ چکی تھی۔

باری کی محبت کی کوئیل لیکن مجھے اس کا بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ یہ محبت ہے۔ باری میرا خیال رکھتا تھا۔ ہم گفتگوں باتیں کرتے تھے لیکن نہ کبھی اس نے اور نہ میں نے اس سے کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ ہماری گفتگو اب زیادہ تر میرے کلام اور میری کہانیوں پر ہوتی تھی جو تو اتر سے چھپ رہی تھیں۔ نقاد میری کتاب پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اکثر مضامین مجھے مس ربانی بھجوا دیا کرتی تھیں۔ چونکہ مجھے اب اسکول چھوڑے چار سال ہو چکے تھے اور میری

الہ عزوجل کے بعد

ہے۔۔۔۔۔ اس گاؤں میں میرے اماں، ابا، بہنیں اور بھائی ہیں۔ اس گاؤں سے تو خون کے رشتے جڑے ہیں باری۔“ میں نے سوچا تھا لیکن کہا نہیں تھا۔
”اس گھر میں تمہیں اتنی محبت ملی۔۔۔۔۔ امی، ابو نے ہمیشہ تمہیں بیٹی سمجھا ہے۔ کبھی تم میں اور ہم میں فرق نہیں کیا۔“

”محبت۔۔۔۔۔؟“ میں نے خالی، خالی نظروں سے باری کی طرف دیکھا اور نگلی میں سر ہلایا۔
”نہیں۔۔۔۔۔ محبت نہیں، ترس، ہمدردی۔۔۔۔۔“
جانے کب کا رہا لاوا بہہ نکلا تھا۔

”کیا صرف ترس اور ہمدردی میں کوئی اس طرح کتا ہے۔۔۔۔۔؟“ باری کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”امی تمہارا کتنا خیال کرتی ہیں۔۔۔۔۔ اور ابو وہ تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ سچ ہے، استانی جی نے میرا ہمیشہ خیال رکھا۔۔۔۔۔ لیکن انہوں نے مجھ سے محبت نہیں کی۔۔۔۔۔ انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کی طرح رکھا۔۔۔۔۔ کھلایا، پلایا لیکن بیٹی سمجھا نہیں۔۔۔۔۔ مجھ پر ان کے احسانوں کا بوجھ ہے۔۔۔۔۔ انہوں نے ہمیشہ سب سے پہلی کہا کہ میری اماں کی پانچ بیٹیاں تھیں اور مجھ پانچویں کو اماں بلاوجہ مارلی تھیں۔ اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ لے آئیں۔“ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

”استانی جی کہتی ہیں، میں جب پیدا ہوئی تو میری اماں کو میری ضرورت نہ تھی۔ انہیں تو دانی کے لیے بھائی چاہیے تھا۔۔۔۔۔ اور استانی جی کو بھی میری ضرورت نہیں تھی۔۔۔۔۔ وہ صرف مجھے اماں کی ناراضی اور غصے سے بچانے کے لیے اپنے ساتھ لے آئی تھیں اور پھر۔۔۔۔۔ سبک کمانے لگیں۔ میں کہیں بھی کسی کو بھی مطلوب نہیں تھی نہ ہوں باری۔“
”تم۔۔۔۔۔ تم مجھے مطلوب ہوویرا۔۔۔۔۔“ باری نے

تمہی ایک بار باری نے کہا تھا۔
”ویرا۔۔۔۔۔ تمہارا دل چاہتا ہے، میا نے ہزارے جانے کو تو میں تمہیں لے چکا ہوں۔ سب سے مل آؤ گی تو یہ بے گل ختم ہو جائے گی۔“

میرے اندر سے ہاں، ہاں کی آواز آرہی تھی لیکن لب خاموش تھے۔۔۔۔۔ میرے اندر ہاں اور نہ کی جگہ شروع ہو گئی تھی پھر انا کی اس جگہ میں طلب اور محبت ہار گئی۔ انا اور خود داری جیت گئی۔ انہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میری طلب نہیں۔۔۔۔۔ بہنوں کی شادیوں پر اماں نے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا۔ کیا تھا اگر وہ مجھے بلا لیتیں۔۔۔۔۔ کتنا شوق ہوتا ہے ناں بہنوں کی شادیوں میں شریک ہونے کا لیکن دل کے اندر جیسے بہت سارے دیوے جل کر بجھ گئے تھے۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میرا نہیں جی چاہتا۔“ میں نے سارے آنسو اپنے اندر اتار لیے تھے۔ میں نے بی ایڈ کیا اور پچھرا سٹر کیا پبلک سروس کمیشن کا امتحان دیا اور پہلے ایس۔ ایس لی پر تقرری ہوئی پھر ایک بڑے اسکول میں ہیڈ مسٹر ایس کی سیٹ ملی۔ استانی جی کے گھر میں سب ہی خوش تھے۔ میری کامیابیوں پر۔۔۔۔۔ باری بھی اب اچھی پوسٹ پر تھا۔۔۔۔۔ اور گھر میں اس کی شادی کی باتیں ہورہی تھیں لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ اس روز باری میری نغمہ مراجعت پر تبصرہ کر رہا تھا۔

”تمہاری اس نغمہ میں تڑپ ہے اپنے اصل کی طرف واپس پلٹ جانے کی۔“

”ہاں شاید۔“

”شاید نہیں یقیناً۔“ وہ مسکرایا تھا۔

”مراجعہ میں ہی نہیں کئی اور چیزیں بھی ہیں تمہاری ایسی جن میں میا نے ہزارے سے پھٹرنے کا دکھ ہے۔ واپس جانے کی تڑپ ہے، تم صرف نو سال کی تھیں تب لیکن تم میا نے ہزارے کو نہیں بھولی ہو۔“
”میا نے ہزارے“ صرف ایک گاؤں نہیں

محبت کی میٹھی، میٹھی سکک بھی شامل ہوگئی تھی۔ مستقبل کے خواب تھے اور امیدوں کے جگنو تھے۔

”شادی کے بعد میں تمہیں مہانے ہزارے لے چلوں گا۔“

”سچ.....“ میرے اندر چراغاں ہو گیا تھا۔

”کب.....؟“

”تمہیں بہت جلدی ہے۔“ وہ شرارت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں دل کی بات کسی سے نہیں کہتی تھی اندر ہی اندر فحش کر لیتی تھی لیکن اب باری سے ہر بات کہنے لگی تھی۔

”چند دنوں کے لیے کراچی جا رہا ہوں، وہاں آکر ملے کرتے ہیں کہ کب..... ویسے امی سے بات ہوگئی ہے، انہیں اعتراض نہیں ہے۔“

اور باری کراچی چلا گیا..... پادھر میرے ٹرانسفر کے آرگنائز آگئے..... ایک قریبی قصبے میں ایک پرائمری اسکول کو مل اسول کا درجہ دیا گیا تھا اور مجھے وہاں بھیجا جا رہا تھا۔ اس اسکول کی ہیڈ بنا کر..... میں نے باری کو فون کیا۔

”کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی ریزائن دے دو اور یوں بھی میں بلا ضرورت خواتین کی جاب کو پسند نہیں کرتا۔۔۔۔۔ ہاں اگر تم کرنا چاہو تو منع بھی نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ مجھے باری کی بات سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا مجھے استانی جی کو بتانا چاہیے کہ میں جاب چھوڑنا چاہتی ہوں۔ اس روز میں بیک میں گھر آگئی تھی۔ استانی جی کے پاس ان کی کوئی پرانی کوئیک آئی ہوئی تھیں۔

”ارے ہاں، تم نے پھر باری کے لیے لڑکی پسند کر لی۔ اگر نہیں کی تو ایک لڑکی ہے، میری نظر میں۔“ میں نے اپنے کمرے کی طرف جاتے، جاتے سنا اور غیر ارادی طور پر اپنے کمرے کے

بے اختیار میرے ہاتھ تھام لیے تھے۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت کہ تم اندازہ بھی نہیں کر سکتیں۔۔۔۔۔ ہر رات سونے سے پہلے میں اللہ سے دعا کرتا ہوں..... اللہ مجھے سویرا کو دے دے۔ اسے میرا رفیق بنا دے..... میں، میں تمہیں چاہوں گا دیر..... اتنا کہ تم میری محبتوں سے اکٹا جاؤ گی، تھک جاؤ گی۔“

”محبتوں سے کبھی کوئی اکٹا یا ہے باری؟“

میری آواز میں لرزش تھی۔ میں نے آہستہ سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

”ہاں، محبتوں سے کبھی کوئی نہیں اکٹا یا دیر.....“ پہلی بار وہ اظہار کر رہا تھا اور میرے اندر کا خلا جیسے بھرنا جا رہا تھا اور دل کی پیاسی زمین سراب ہو رہی تھی۔ وہ شاعر یا ادیب نہیں تھا لیکن اس کے پاس اظہار کے اتنے خوب صورت لفظ ہوں گے۔

مجھے یقین نہیں تھا۔

ایک بار اس نے اپنے جذباتوں کا اظہار کیا تھا کہ اب تو آتے جاتے اس کی آنکھیں جذبے لٹا لٹا کر

جب بھی وہ اور میں اکٹھے ہوتے، میری شاعری پر بات کرتے، کرتے وہ موضوع سے ہٹ جاتا۔

”دیر! تمہیں پتا ہے تم کتنی خوب صورت ہو..... لیکن تمہارا حسن ایک دم فوراً پہلی نظر میں دل میں نہیں کھتا، ہولے، ہولے سرچڑھ کر بولتا ہے۔ پہلے یہ قاتل آنکھیں قتل کرتی ہیں پھر یہ پلوں کے بھالے دل میں کھب جاتے ہیں اور پھر یہ دلکش ہونٹ اپنی رعنائیاں.....“

”تمہیں تو ادیب یا شاعر ہونا چاہیے تھا باری۔“ میں ہنسی۔

”میری بیوی شاعر ہوگئی..... کیا یہ کافی نہیں ہے۔“ اس کی نظر میں میرا طواف کرتیں۔ ان دنوں میں اتنی خوش تھی جتنی کبھی نہیں تھی۔ اور ان دنوں میری شاعری میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ اب اس میں

f PAKSOCIETY

چلا آیا۔

”یہ کیا حماقت ہے ویرا.....؟“

”حماقت..... نہیں تو.....“ میری آنکھوں کے

خالی پن نے باری کو چونکا دیا۔

”کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں.....“ میں نے نظریں چرائی تھیں۔

”میں تھک گئی ہوں۔“ میری جلتی ہوئی

آنکھوں میں چھین تھی۔

”مزید احسانوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ ان

احسانوں کے بوجھ سے میری گردن جھک کر ٹھوڑی

سے آگئی ہے، اب ٹوٹ جائے گی۔ میں نے استانی

جی کا گھر چھوڑ دیا ہے۔ مجھ پر ان کے احسانوں کا

بوجھ ہے۔ میری گردن اس بوجھ سے ہمیشہ جھکی رہے

گی..... لیکن مجھ پر ان کی محبت کا بوجھ نہیں ہے۔

احسانوں کا بدلہ اتارا جاسکتا ہے تاں باری لیکن محبت

کا نہیں..... اور میرا رُواں، رُواں ان کا احسان مند

ہے..... میں ساری زندگی ان کی خدمت کر کے بھی

ان احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتی کہ انہوں نے مجھ

بے مایہ، حقیر کو میاں بھرتے کے کپے و پیرے سے

اٹھا کر کیا سے کیا بنا دیا..... میں جو کچھ ہوں ان کی وجہ

سے ہوں..... لیکن مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں

ہے..... میں وہاں رہ کر اپنے دل کو..... روک نہیں

سکوں گی..... تم نے مجھے کیوں چاہا..... باری.....

کیوں محبت کی؟“

وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا..... بڑی دیر بعد

اس نے سر اٹھایا۔ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں

سویرا۔“ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ”اور

تم..... کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں.....؟“ میں

نے سر جھکا لیا۔

”میں ہوش سنبھالنے کے بعد سے محبت ہی کے

لیے تڑپ رہی ہوں۔ اماں، بابا کی محبت کے لیے.....

استانی کی اور انکل کی محبت کے لیے..... پھر اللہ نے

بن مانگے ہی میری جھولی میں محبت ڈال دی۔ ایسی

محبت جس کی میں نے طلب نہیں کی تھی..... اور اس

محبت نے میرے اندر رنگ بکھیر دیے، روشنیاں

پھیلا دیں لیکن.....“ میں نے ایک گہری سانس لے کر

جھکا ہوا سر اٹھایا۔ وہ بے چینی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”بولو تاں..... بولتی کیوں نہیں ہو..... کیا تمہیں

مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

مجھے اس سے محبت تھی..... ہے..... اور ہمیشہ

رہے گی لیکن میرے اندر جو ایک پہاڑ سا اٹھ آیا

تھا..... انا کا پہاڑ یا پھر..... پتا نہیں کیا..... اس نے

میرے لب ہی دبے تھے۔ میں محبت کو محبت کی طرح

قبول کرنا چاہتی تھی..... احسان کی طرح نہیں۔

”اپنے ساتھ یہ ظلم مت کرو ویرا..... میں جانتا

ہوں تم میرے بغیر رہ نہیں سکو گی۔“

”اے سارے سال بھی تو محبت کے بغیر

آزار رہے ہیں۔“

”تھیک ہے تم رہ لو گی لیکن میں نہیں.....“ وہ

رواںسا ہو رہا تھا۔

”سنو ہم دونوں کہیں الگ رہ لیں گے جہاں

تمہیں یہ نہ لگے کہ تمہیں چاہت سے اس گھر میں

نہیں لایا جا رہا بلکہ احسان کر کے.....“

”تم مجھے ایسا سمجھتے ہو باری؟“ مجھے غصوں ہوا

تھا۔ ”استانی جی کے احسانوں کا بدلہ میں ان کا بیٹا

جھین کر دوں۔“

اور وہ چلا گیا..... مجھے پتا تھا کہ وہ پھر آئے گا۔ دو

روز بعد وہ پھر آ گیا..... اور وہ آتا رہتا حتیٰ کہ میں ہار

جاتی..... میں اس کے سامنے کمزور پڑنے لگی تھی۔

”اچھا ایسا کرو میاں نے ہزارے چلی جاؤ.....

میں وہاں سے تمہیں پوری چاہت کے ساتھ بیاہ کر لے

آتا ہوں۔“ اس روز جب وہ آیا تھا تو اس نے کہا تھا۔

لیکن میں کیوں جاتی میاں نے ہزارے وہاں کسی

کو میری چاہ نہیں تھی..... اماں نے خود مجھے دے دیا

الک عمر کے بعد

کبھی کہیں کسی کو انٹرویو نہیں دیا، کبھی کسی شاعرے میں شرکت نہیں کی..... جہاں کہیں میں جاتی وہاں میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میں ہی سویرا اقبال ہوں..... جس کا نام ادب میں معتبر سمجھا جاتا ہے..... کئی بار میرے سامنے بیٹھ کر میری کوئی شاعری کی تعریف کرتی رہیں لیکن میں لب سے ہنسی رہی..... میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے جانے اور مجھے کھوجتا ہوا یہاں تک پہنچے..... میں انٹرویو نہیں دیتی تھی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو میرے ویرا ہاؤس کا پتا چلے اس لیے نہیں کہ میرے حوالے میرے لیے شرمناک تھے..... بلکہ اس لیے کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو پتا چلے کہ میں کسی کو مطلوب نہیں تھی اور اتنے سالوں بعد نہ جانے کہاں غلطی ہوئی تھی مجھ سے کہ سراج الحق اور عرفان منیر کھوجتے ہوئے آگئے تھے۔ میں نے سوچا اور.....

"اوہ..... میرے خدایا!" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

☆☆☆

یہ آج سے چاروں پہلے کی بات تھی۔ آفس میں وہ کون تھی..... مجھے نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ کوئی اسکول ٹیچر تھی کسی کام کے سلسلے میں آئی تھی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"اوسے آپ سویرا ہوں..... ہم نے سیالکوٹ میں ایک ہی اسکول میں پڑھا ہے..... آپ نے ان دنوں لکھنا شروع کیا تھا..... میں دسویں جماعت میں تھی اور آپ نویں میں..... مس ربانی ہماری کلاس میں آئیں تو بہت تعریف کرتی تھیں آپ کی..... اب جہاں کہیں بھی آپ کی کوئی تحریر چھپتی ہے، میں ضرور پڑھتی ہوں، میں سب کو بتاتی ہوں یہ اتنی مشہور شاعرہ میری اسکول فیلو ہے۔"

وہ بغیر رکے بول رہی تھی اور اتنے یقین سے بات کر رہی تھی کہ میرے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں

تھا اور پھر کبھی پلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں..... جب سے میں نے جاب کی تھی کئی بار سوچا تھا کہ کسی روز دین پر بیٹھوں اور چپکے سے میانے ہزارے میں دین محمد زمیندار کے گھر کا دروازہ کھول کر اس بڑے سے کچے صحن میں پانچ جاؤں اور جہاں چار پائی پر بیٹھے حقہ پیتے اہانجھے دیکھ کر حقہ پینا بھول جاؤں اور چولہے کے پاس بیٹھی گیلی لکڑیوں کو پھولیں مارتی اماں کی آنکھوں میں حیرت اتر آئے اور میری ہنسن اور بھائی قطار بنا کر حیرت سے مجھے دیکھیں..... لیکن میں بھلا کیوں جاتی..... انہیں کب میری طلب یا چاہت تھی اور میرے اندر جو انا کا پہاڑ ایک روز آپوں آپ کھڑا ہو گیا تھا وہ ہر روز پہلے سے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ ہر روز میں سونے سے پہلے میانے ہزارے جانے کا ارادہ کرتی اور ہر روز صبح اٹھنے پر میری انا مجھے کچھ کے مارتی اور میں خود سے کہتی۔ نہیں مجھے نہیں جانا..... سو میں نے سوچا وہ آتا رہتا تو ایک روز میں اس کی محبت کے سامنے کمزور پڑ جاتی یا اپنی محبت کے سامنے سو میں نے دو ماہ کی چھٹی لی اور مس ربانی کے پاس لاہور چلی آئی۔ مس ربانی جو ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور سٹیل ہو گئی تھیں جو میری محسن تھیں، میری استاد تھیں..... اور جنہوں نے ابھی تک میری انگلی پکڑی ہوئی تھی پھر ان کی ہی کوشش سے میں نے کسی اور جگہ ٹرانسفر کروا لیا۔ مس ربانی نے مجھے سمجھا یا۔

"محبت سے منہ موڑ کر دکھ پاؤ گی۔ وہ لوگ جنہیں تم چھوڑ آئی ہو، انہوں نے ہی تمہیں اس مقام تک پہنچایا ہے..... صرف ترس و ہمدردی میں کوئی ایسا نہیں کرتا سویرا..... کچھ لگاؤ تو ہو گا ناں انہیں۔" مجھے سمجھانے کے باوجود میرے عمل کو غلط سمجھنے کے باوجود انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ میرے میگزین، میری ڈاک، میری رائٹنگ سب انہی کے ایڈریس پر آتی تھی اور پھر وہ مجھے اکٹھی بھجوا دیتیں۔ میں نے

تھا..... میں اس سے یہ مجھوٹ نہیں بول سکتی تھی کہ نہیں میں وہ سویرا اقبال نہیں ہوں..... وہ مجھے ہائے نہیں بھی پہچانتی تھی اور..... اس نے میری کتابوں کے سلسلے میں ہونے والی ایک دو تقریبات میں بھی شرکت کی تھی۔

”میں تو صرف آپ کی خاطر وہاں گئی تھی لیکن پھر وہاں ہوا چلا کہ آپ نہیں آئیں ایسی تقریبات میں۔ مس ربابی بتا رہی تھیں کہ آپ کے والدین پسند نہیں کرتے۔ دراصل میرے شوہر صحافی ہیں تو ہمیں ایسی تقریبات کے کارڈ مل جاتے ہیں۔“

”تو یہ بات ان محترمہ سے ہی لیک آؤٹ ہوئی تھی۔ اوہ مائی گاڈ.....“

مجھے یاد آیا جب آفس آئی تھی تو کسی نے بتایا تھا کہ مسز عرفان آئی ہیں تو..... وہ مسز عرفان.....

”میڈم جی آپ کا فون ہے۔“

ماسی خیراں نے دروازے سے جھانکا تو میں چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آفس سے آیا ہے جی ساجد صاحب کا.....“

ساجد سے بات کر کے میں ماسی خیراں کو ایک کپ چائے بنانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آئی۔

جسم و جان میں اتنی تکلیف تھی جیسے زخموں کے ٹکے کھل گئے ہوں۔ کسی پلہ جھن نہیں..... دل بہت.....

بے کھل تھا میں نے اچھا کیا تھا یا برا..... میں آج یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اندر دور تک پیاس کا صحرانگ آیا تھا۔ اس پیاسی زمین پر باری کی محبت کے جو چند قطرے پڑے تھے۔ ان کی ٹھنڈک ہمیشہ ہی رگ و

پے میں سکون اتار دیتی تھی لیکن آج..... میں نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو رگڑا..... یہ میں نے کیا کیا

تھا میں باری کی محبت سے بھی بھاگ آئی تھی۔ باری جو کہتا تھا کہ وہ مجھ سے اتنی محبت کرے گا کہ برسوں کی پیاس بجھ جائے گی لیکن میں نے اس کی محبت کا مان

بھی توڑ دیا تھا یہ اور استانی جی..... کتنا خیال رکھا

تھا..... میں اس سے یہ مجھوٹ نہیں بول سکتی تھی کہ نہیں میں وہ سویرا اقبال نہیں ہوں..... وہ مجھے ہائے نہیں بھی پہچانتی تھی اور..... اس نے میری کتابوں کے سلسلے میں ہونے والی ایک دو تقریبات میں بھی شرکت کی تھی۔

”میں تو صرف آپ کی خاطر وہاں گئی تھی لیکن پھر وہاں ہوا چلا کہ آپ نہیں آئیں ایسی تقریبات میں۔ مس ربابی بتا رہی تھیں کہ آپ کے والدین پسند نہیں کرتے۔ دراصل میرے شوہر صحافی ہیں تو ہمیں ایسی تقریبات کے کارڈ مل جاتے ہیں۔“

”تو یہ بات ان محترمہ سے ہی لیک آؤٹ ہوئی تھی۔ اوہ مائی گاڈ.....“

انہوں نے میرا..... انصار بھائی اور ابصار بھائی بھی کبھی خالی ہاتھ نہیں آئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ میرے لیے لاتے پھر بھی ہاتھ نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ جیسے انہوں نے مجھ سے محبت نہیں کی۔

”اور کیا میں احسان فراموش ہوں.....؟“

میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور خیراں کی لائی گرم چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

”نہیں.....“ میں نے ایک بار پھر خود کو یاد کرایا۔ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ بس میں محبت کو محبت کی طرح دل میں زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ اسے

احسان ٹھیک رہنا چاہتی تھی۔ اس لیے تو میں نے باری سے التجا کی تھی کہ مجھ سے میری محبت مت چھینے لیکن وہ میری بات سمجھ ہی نہیں پارہا تھا اور میں نے محبت کو

احسان میں ڈھلنے سے بچا لیا تھا لیکن پھر بھی میرا دل کیوں خالی خالی سا لگتا ہے حالانکہ یہ باری کی محبت سے لیا ہے۔ پھر بھی..... کیا

میرے اندر نہیں پچھتاوے کی کھل آگ چکی ہے۔“

میری آنکھیں جلتے لگیں اور میں اپنی سوچوں سے گھبرا کر کچن میں خیراں کے پاس چلی آئی اور کوکنگ میں

اس کی ہیلپ کرنے لگی لیکن دھیان تھا کہ بار بار پھر ماضی کی طرف چلا جاتا..... پورا دن میں بے کل اور

بے چین رہی اور رات میں مجھے سکون کی گولی لینی پڑی۔ کبھی، کبھی مجھے یونہی نیند کی گولیوں کا سہارا لینا

پڑتا تھا۔ جب باری پاؤ آتا، جب اپنی بے قدری کا خیال آتا اور جب تنہائی ستاتی تو نیند کی ایک چھوٹی سی

گولی میری بے چینیوں کو دور کرتی تھی۔ اگلی صبح میں ابھی تو کسی حد تک فریش تھی۔ ناشتے کی ٹیبل پر

میں نے عادت کے مطابق اخبار کھولا، ڈیلی اخبار کے ساتھ ایک مقامی اخبار بھی تھا۔ چار سکوں پر

مشتمل اس اخبار کے پہلے صفحے پر ہی ایک خبر نے مجھے چونکا دیا۔

”ہمارے شہر میں مشہور شاعرہ سویرا اقبال کی

تھا..... میں اس سے یہ مجھوٹ نہیں بول سکتی تھی کہ نہیں میں وہ سویرا اقبال نہیں ہوں..... وہ مجھے ہائے نہیں بھی پہچانتی تھی اور..... اس نے میری کتابوں کے سلسلے میں ہونے والی ایک دو تقریبات میں بھی شرکت کی تھی۔

”میں تو صرف آپ کی خاطر وہاں گئی تھی لیکن پھر وہاں ہوا چلا کہ آپ نہیں آئیں ایسی تقریبات میں۔ مس ربابی بتا رہی تھیں کہ آپ کے والدین پسند نہیں کرتے۔ دراصل میرے شوہر صحافی ہیں تو ہمیں ایسی تقریبات کے کارڈ مل جاتے ہیں۔“

”تو یہ بات ان محترمہ سے ہی لیک آؤٹ ہوئی تھی۔ اوہ مائی گاڈ.....“

دیر بعد مسز افضل جو ہائی اسکول نمبر ۱ کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔۔۔ آئیں۔۔۔ انہیں رخصت کر کے میں جوئی مڑی ایک دم دروازہ کھول کر کسی نے کہا۔
”سے آئی کم این میم!“

یہ آواز۔۔۔ میں ایک جھٹکے سے مڑی اور پھر وہیں ساکت کھڑی ہوئی۔ میرے دہم دگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ باری ہوگا۔
”باری تم۔۔۔؟“ یہ مشکل میرے لبوں سے نکلا تھا۔

”جہیں توقع تو نہیں ہوگی کہ میں بھی تمہیں ڈھونڈتا ہوں تم تک آ پہنچوں گا۔“

”باری آؤ بیٹو۔۔۔“ میں نے تھوک نلگتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میز کا چکر کاٹ کر میز کے پیچھے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ میں نے نظریں اٹھائیں وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔
مجھے لگا جیسے میرا دل ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر

آمد۔۔۔۔۔“ عرفان منیر نے ڈی ای او کی حیثیت سے میری تقرری کی خبر چھاپی تھی اور میری شاعری اور دوسری تحریروں کے اور ادب میں میرے مقام کے حوالے سے چھوٹا سا نوٹ لکھا تھا۔

مجھے از حد کوفت ہوئی لیکن ظاہر ہے اب میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بہتر تھا کہ میں یہاں سے جلد از جلد تاراج کروانے کی کوشش کروں۔ میں نے سرسری سی نظر اخبار پر ڈال کر اخبار بے پروائی سے ایک طرف رکھ دیا، مجھے یہ اطمینان تھا کہ یہ ایک مقامی اخبار ہے اور اس شہر میں بھلا کتنے لوگ ہوں گے جنہیں ادب سے کوئی تعلق ہوگا اور جو سویرا اقبال کو جانتے ہوں گے۔۔۔۔۔ باری، استانی جی سب سیالکوٹ میں تھے اور بھلا یہ اخبار کہاں سیالکوٹ جاتا ہوگا۔۔۔۔۔ میں نے پُر سکون ہو کر ناشتا کیا اور آفس آئی۔۔۔۔۔ میرا ارادہ تھا کہ میں آج شہر کے اسکولوں کا وزٹ کروں گی لیکن میرے آفس جانے کے کچھ ہی

سینٹ ایلینور کالرز

ہارمونیسٹ ڈیولپنگ ایجنٹس کریم (ہرٹل)

مہلکی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی مٹائی کو دوبارہ کر کے نئی بناتی ہے۔ بریسٹ کو سہل اور خوشحالت دلاتی ہے۔

Rs. 250/-

چہرے کے فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

گلیسی

یونانی کریم

چہرے کی فاضل بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرتی ہے۔

ہارمونیسٹ ڈیولپنگ ایجنٹس کریم (ہرٹل)

مہلکی بریسٹ میں اضافہ کر کے بریسٹ کی نشوونما مکمل کرتی ہے
بریسٹ کی مٹائی کو دوبارہ کر کے نئی بناتی ہے۔ بریسٹ کو سہل اور خوشحالت دلاتی ہے۔

0343-7000088

051-5502903-5533528

042-7666264

Call: 0333-5203553, Web: www.davapakistan.com

باہر آگرے گا۔

”بیٹھ جاؤ پلیز۔۔۔“ میں نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ ہولے، ہولے چلتا ہوا میری ٹیبل کے سامنے آیا اور دونوں ہاتھ ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

”سب۔۔۔۔۔ سب کیسے ہیں۔۔۔۔۔ استانی جی، انکل، انصار بھائی؟“

”تمہیں کیا سویرا اقبال۔۔۔۔۔ تم تو سب کو چھوڑ آئی تھیں۔ سو تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون کیسا ہے؟“ اس کی آواز دھیمی لیکن مضبوط تھی۔

”اگر ان میں سے کسی کو کچھ ہو جائے تو کیا مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیا واقعی۔۔۔۔۔؟“ میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور میرا دل زور سے کانپا۔۔۔۔۔ ”اللہ نہ کرے کسی کو کچھ ہو۔۔۔۔۔“ میں نے زیر لب کہا۔

”تم خود کو کیا سمجھتی ہو سویرا اقبال۔۔۔۔۔؟“ ناراضی

اس کی خوب صورت آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ ”تم نے بھی سوچا کہ جن لوگوں کو تم بلا قصور چھوڑ آئی ہو، وہ تمہارے لیے کتنا ترستے ہوں گے، کیسے گزرتے ہوں گے ان کے شب و روز، کیسے تم نے سارے گھر میں خزانیں بکھیر دیں۔ کبھی سوچا تم نے؟ کب، کب یاد نہیں کیا ہو گا انہوں نے۔۔۔۔۔ لیکن تم۔۔۔۔۔“

”میں۔۔۔۔۔؟“ میں نے نظریں نہیں اٹھائیں لیکن میں جانتی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر طویہ مسکراہٹ ہوگی۔

اور کیا میں نے یاد نہیں کیا انہیں صبح شام۔۔۔۔۔ دن و رات جب کوئی عید، تہوار آتا تو مجھے یاد آتا تھا کہ کیسے انصار بھائی اور انصار بھائی مجھے چوڑیاں پہنانے لے جاتے تھے، کیسے استانی جی میرے کپڑے تیار کرواتی تھیں، صوبیدار انکل، انصار بھائی، کبھی سے مشورہ کیا جاتا تھا۔۔۔۔۔ میرے آنسو میرے اندر گرتے تھے اور میں نے ان جیتے سالوں

میں کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔

”یوں تو تم بڑی حساس بنتی ہو۔“ اس نے میز پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا اور تھوڑا سا اور آگے جھکا۔

”لیکن تم نے شاید ہی کبھی سوچا ہو کہ وہ لوگ تمہارے لیے کتنا ترستے ہوں گے، کتنا یاد کرتے ہوں گے تمہیں۔ ان کی راتوں کا آغاز اور دن کا اختتام تمہاری باتوں پر ہوتا ہے، سویرا اقبال۔۔۔۔۔ اسی ہر صبح تمہارے کمرے کی صفائی کرواتی ہیں، تمہاری کتابیں اور تمہاری چیزیں یوں جھاڑ پونچھ کر رکھتی ہیں جیسے بس تم آنے ہی والی ہو۔۔۔۔۔ ابو بے دھیانی میں دن میں کتنی بار تمہیں یاد دہشتے ہیں۔۔۔۔۔ امی، ابو کا خیال ہے کہ ان کی محبت تمہیں واپس لے آئے گی لیکن۔۔۔۔۔“ وہ جلتے ہوئے انداز میں ہنسا۔

”وہ نہیں جانتے کہ تم نے ان کی محبت کو محبت کب جانا۔ تمہارے خیال میں تو وہ ترس اور ہمدردی بھی نرم تھا، نیکی کمانے کی خواہش تھی، وہ روتی ہیں، میں منع کرتا ہوں تو وہ کہتی ہیں، گھر میں مرغی بھی رکھو تو اس سے محبت ہو جاتی ہے، تمہیں تو وہ بیٹی بنا کر لائی تھیں اور بیٹی کی طرح ہی چاہا۔۔۔۔۔ لیکن انہیں کیا پتا۔۔۔۔۔“ اس کا لہجہ حریدہ تھا۔

”ان کی انکلیجکل بیٹی کو محبت اور ترس کا فرق ہی نہیں پتا۔۔۔۔۔ معاف کرنا سویرا اقبال، تم ساری زندگی محبت کی طالب رہیں لیکن محبت کو پہچان نہیں پائیں، تمہیں پتا ہی نہیں کہ محبت کیا ہوتی ہے، تمہارے پاس وہ نظر ہی نہیں ہے، تمہارے سارے لفظ اور جذبے کھوکھلے ہیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“ میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ تم تو یہ بھی نہیں جان پائیں کہ میں تمہارے بغیر۔۔۔۔۔ اور تم نے میری محبت پر بھی اعتبار نہیں کیا۔“ اس کی آواز آہستہ ہو گئی اور آنکھیں جیسے کسی اندرونی تپش سے سلگنے لگیں۔

”تم ساری عمر خود ترسی میں جلا رہی ہیں اور اپنے

آلہ عمر کے بعد

اتنے برسوں کے بعد ملے ہو تو یوں خفا ہو کر مت جاؤ پلیز کچھ دیر تو بیٹھو..... سنو، میں بھی بہت تڑپی ہوں، بہت روئی ہوں اور پلیز میرا یقین کرو باری، تمہاری محبت..... ایک تمہاری ہی محبت پر تو اعتبار تھا مجھے..... اور اسے ہی تو زندہ رکھنا چاہتی تھی ہمیشہ..... اس نے بے حد شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”اسے زندہ رکھنا چاہتی تھیں؟ میری محبت کو

اور مجھے ہی مار دیا۔“

”نہیں.....“

میری آنکھیں پھر سمندر بن گئیں۔

”تم بہت احمق ہو دیرا۔“ اس کے سننے ہوئے

نقوش ڈھیلے ہوئے تھے لیکن اس کی آنکھوں سے ہنوز ناراضی نکلتی تھی۔

”پلیز باری کچھ دیر تو بیٹھ جاؤ، مجھے بتاؤ

اماں کے متعلق ابا کے متعلق..... استانی جی اور انگل

کے متعلق..... اچھا چلو یہ ساتھ ہی میرا گھر ہے وہاں چل

کر آرام سے بات کرتے ہیں۔“ میں نے سچی

نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے سر ہلا دیا۔ میں

نے جلدی سے میز پر پڑا اپنا چنڈ بیگ اٹھایا تو اس نے

بخور مجھے دیکھا اور واش روم کی طرف اشارہ کیا۔

”جاؤ منہ دھو کر آؤ۔“

”ہاں۔“ اب میں ان روئی آنکھوں اور بھیکے

چہرے کے ساتھ باہر جاتی تو دیکھنے والے جانے کیا

کیا گمان کرتے..... میں فوراً واش روم کی طرف

چلی گئی اور جب اچھی طرح چہرہ دھو کر اور تازہ لب

اسٹک لگا کر باہر آئی تو وہ بے حد سنجیدہ سا بیٹھا تھا

میرے آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا..... اور کچھ دیر

بعد وہ میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

”اکیلے رہتے ڈر نہیں لگتا تمہیں.....؟ تم تو

بہت ڈرپوک ہوتی تھیں۔“

اسے شاید بہت پہلے کی بات یاد آئی تھی۔

”پہلے ہاسٹل میں رہتی تھی پھر جب اس سیٹ پر

وارد گرد موجود مچھڑوں کو پہچان ہی نہیں پائیں۔ میں گیا تھا

مہمانے ہزارے..... میں نے دیکھی تمہاری اماں اور

تمہارے ابا کی تڑپ..... تمہیں ایک نظر دیکھنے کو تڑپتے

ہیں وہ..... میں نے بتایا انہیں کہ تم کیا سمجھتی ہو کہ.....

تمہاری اماں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔“

”میرا اندر خالی ہو گیا ہے بیٹا..... ایک بار بالی

کو لے آؤ اسے سینے سے لگا لوں تو.....“

”بس کرو باری.....“ میرے لہجوں سے یہ

مشکل نکلا تھا۔ آنسوؤں نے میرے حلق میں گولا سا

بنادیا تھا۔

”کب سے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تمہیں، کتنی بار

مس ربانی کے دروازے تک بھی پہنچا..... لیکن تمہارا

پتا نہیں چل سکا..... آج آفس میں اگر اخبار پر نظر نہ

پڑتی تو..... مجھے ایک سال ہو گیا ہے اس شہر میں آئے

لیکن میں نے کبھی مقامی اخبار نہیں پڑھا.....

خیر.....“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”پالنے والے ماں، باپ سے نہیں لیکن جنم

دینے والی ماں سے ایک بار ضرور ملنے بھی جانا سویرا

اقبال، جس کی نظریں ہر وہ دروازے کی طرف ہی لگی

رہتی ہیں۔“ وہ جانے کے لیے مڑا۔

”باری.....“ میرے حلق سے سچ کی طرح

نکلا تھا اور پھر میرے اندر سے سمندر اٹل پڑے،

برسوں سے منجمد کلیئر کھل رہے تھے، میں پتا نہیں

کیسے آئی تھی، کیسے میز کے پیچھے سے نکل کر باری تک

آئی تھی اور اس کا بازو تھامے بلک رہی تھی اور وہ

ساکت کھڑا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی میں اس کا

بازو تھامے بلکتی رہی پھر اس کے ساکت وجود میں

جینش ہوئی اس نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر

ہولے سے سہلایا اور پھر آئی ہوئی آواز میں بولا۔

”مت رو دیرا مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“ اس نے

آہستہ سے اپنا بازو چھڑ لیا اور جانے کے لیے ہٹا۔

”نہیں..... نہیں باری اس طرح مت جاؤ،

آئی تو....." میں اسے مختصر لفظوں میں بیٹے سالوں کی ساری رو داد سنارہی تھی۔ اس نے بھی مجھے بتایا کہ وہ کتنی بار میاں نے ہزارے گیا اور یہ کہ اماں چاہتی تھیں کہ میں پڑھ جاؤں، میرا شوق دیکھ کر ہی انہوں نے دل پر پتھر رکھا تھا وہ مجھے ملنے اس لیے نہیں آتی تھیں کہ میں ان کا دل بے ایمان نہ ہو جائے اور وہ مجبور ہو کر مجھے استانی جی کے گھر سے لے جائیں۔

"میں نے ہر وہ بات ان سے کہہ دی ویراجو تم نہیں کہہ سکتی تھیں۔" اب اس کی آنکھوں میں نرمی تھی..... اور وہی محبت بھری حدت جو ہمیشہ ہوتی تھی۔

"تمہارے ابا حیران ہو کر میری باتیں سنتے تھے کہ اتنی چھوٹی عمر میں تم اس طرح سوچتی تھیں۔ انہیں اگر تمہارے خیالات کا علم ہو جاتا تو وہ ضرور تمہیں گود میں بٹھا کر اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلاتے، انہوں نے کہا انہوں نے کبھی بیٹیوں کی پیدائش پر گلے یا ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ اللہ نے بنا بھی تو دیا تھا ہاں شکر ادا کرنے کے لیے..... اور وہ کہتے بھی تھے وہ تم سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں، کیونکہ تم ان سے دور ہو۔"

میری آنکھوں سے ہلکے پھلکے پڑے تھے۔
"اور ای کہتی ہیں کہ انہوں نے تمہیں کبھی اس لیے امی کہنے کے لیے نہیں کہا کہ کہیں تمہیں اچھا نہ لگے کیونکہ تم چھ سال کی تھیں تب اور تمہیں پتا تھا کہ تمہاری اماں اور ابا کون ہیں اور استانی جی تمہاری امی نہیں ہیں حالانکہ ان کا کتنا دل چاہتا تھا کہ تم انہیں بھی امی کہو....."

"باری میں بہت بے وقوف ہوں۔"
"ہاں....." اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ کو میں نے مسودار ہوتے نہیں دیکھا لیکن مجھے لگا جیسے وہ مسکرا رہا ہو..... لیکن جب میں نے سراٹھا کر دیکھا تو وہ سنجیدہ چہرہ لیے بیٹھا تھا۔

"ہاں ویرا تم..... تمہارے اندر جو یہ ادیب و شاعر چھپا بیٹھا تھا ناں..... اس نے تمہیں حساس بنا دیا تھا اور نہ ہر گھر کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں، اکثر والدین اس طرح اپنی اولاد سے اپنی محبتوں کا اظہار نہیں کرتے..... لفظوں میں پیار کر کے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انہیں اولاد سے محبت نہیں ہے، تمہارے ابا صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کر کے گھر آتے تو اتنے تھکے ہوئے ہوتے ہوں گے کہ بچوں سے لاڈ کرنے، پیار کرنے کے لیے ان کے پاس نہ وقت ہوتا ہوگا، نہ صحت اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ..... وہ تم سے محبت نہیں کرتے تھے اور ای تمہارے جانے کے بعد وہ اکثر کہتی تھیں پیدا کرنے سے زیادہ پالنے کی محبت ہوتی ہے اور یہ پالنے کی محبت ہی عالم ہوتی ہے۔"

"لیکن بھری باری، محبت کو اظہار کی ضرورت تو ہوتی ہے، ہمیشہ نہ سنی بھی، کبھی تو....." میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ "اگر تم مجھ سے محبت کا اظہار نہ کرتے تو مجھے کیسے پتا چتا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"خیر مجھے تو پتا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" اس نے بے پروائی سے کہا تو میں عجوب سی ہو گئی۔
"تم نے سب کا بتایا باری اپنے بیوی، بچوں کا نہیں بتایا، کیا یہاں ساتھ ہی رہتے ہیں یا استانی جی کے پاس.....؟"

"اول تو یہ کہ تم نے پوچھا ہی نہیں اور وہ تم یہ کہ بیوی ہی نہیں ہے تو بچے کہاں سے آئیں گے۔"
"تو..... تو کیا تم نے شادی نہیں کی ابھی تک.....؟" وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور مجھے لگا جیسے میرے دل کی جلتی جلتی زمین پر پتھر سے ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی ہو، ابھی کچھ دیر پہلے مجھے لگ رہا تھا جیسے پیاس سے میرے حلق میں کانٹے اگ آئے ہوں لیکن اب ہوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے ٹھنڈے

ایک عمر کے بعد

کچے بڑے سے دمڑے میں رہنے والی تمہاری اماں کو تمہاری طلب نہ ہو لیکن یہ بھی مت سوچنا کہ انہیں تم سے محبت نہیں تھی..... یہ محبت تو خود بخود ماں اور اولاد کے درمیان وجود پاتی ہے، بڑھتی ہے اور نکادہ درخت بن جاتی ہے۔ "وہ ہولے، ہولے دھیسے لہجے میں ایک بار پھر سمجھا رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میرے ارد گرد پھول برس رہے ہوں۔ جیسے تپتے صحراؤں سے میں یکا یک ہرے بھرے گلستانوں میں آگئی ہوں، میرے پاؤں تلے نرم ٹھنڈی ٹہلی گھاس ہو اور میرے چاروں طرف ٹھنڈی خوشبودار ہوائیں چلتی ہوں۔ اس روز میں باری کے ساتھ سائیکلوٹ آئی تھی اور استانی جی کے گلے لگ کر بے تاملانہ وہاں پہنچے ہوئے میں نے ان سے معافی مانگی تھی..... اور پہلی بار انہیں امی کہہ کر بلایا تھا۔ استانی امی نہال ہو رہی تھیں اور صوبیدار انگل خاموش ہو کر ہمیں دیکھتے تھے..... اور پھر اگلے دن میں باری کے ساتھ میاں نے ہزارے آئی تھی..... نو سال کی عمر میں میاں نے ہزارے سے چھڑ کر آج پھر وہاں تھی..... اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے کھڑے میری اہمیت جواب دے گئی تھی لیکن باری نے مجھے سہارا دیا اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں اندر قدم رکھنے کا حوصلہ نہ کر پاتی لیکن وہ تھا میرے ساتھ اور میں نے اس کے ساتھ جیسے سیکڑوں سالوں کے بعد اس بڑے سے کچے مچن میں قدم رکھا تھا جہاں میں نے کتنی ہی بار پیو کے ساتھ ایکلی ڈالٹی تھی اور پھر چکرا کر گر پڑتی تھی۔ اندر وہی منظر تھا جو میری آنکھوں کی پٹیوں میں ٹھہر سا گیا تھا۔ لہا سفید اور سیاہ ڈبیوں والا کھیس لوڑھے نیم دراز تھے اور پاس ہی حد پڑا تھا اور ان کی چار پائی کی پانچٹی ہی تو جمال ان کے پاؤں دہا رہا تھا۔ ہاں وہ جمال ہی تو تھا جسے میں نے صرف چند دن کا دیکھا تھا۔ اور اماں چو لھے سے جلتے انگارے لال کر ایک ہترے پر

میٹھے پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگا دیا ہو۔
"ہاں اگر ہو سکے تو ایک بار اپنی اماں کو بھول کر میاں نے ہزارے کا چکر ضرور لگا لینا۔" چہرے پر گہری سنجیدگی لیے وہ مڑا تو میں نے بے اختیار کھڑے ہوتے ہوئے اسے بلایا۔

"لیکن باری تم نے تو کہا تھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ میاں نے ہزارے لے کر جاؤ گے تو کیا بھول گئے؟"
"نہیں، میں تو نہیں بھولا لیکن شاید تم بھول گئی تھیں۔" وہ یک دم واپس مڑ کر میرے مقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ.....

"میں نے کچھ اور بھی کہا تھا دیرا..... لیکن تمہیں یاد نہیں۔"

"مجھے یاد ہے۔" میری نظریں جھک گئیں اور پلکیں لرزنے لگیں یوں جیسے میں کوئی عین ابھڑکی تھی۔
"تو تمہیں یہ تو نہیں لگے گا کہ میں تم سے شادی تم پر احسان کرنے کے لیے کر رہا ہوں؟"

میری لرزتی پلکوں پر موتی ایک لمحے پتا نہیں آج کہاں سے اتنا پانی میرے ہاتھوں سے لگا گیا تھا۔
"محبت احسان نہیں ہوتی دیرا....." اس نے اپنی انگلیوں کی پودوں سے میری پلکوں کے موتی جن لیے۔
"اور محبت کو کبھی احسان مت سمجھنا۔" اس نے سمجھہ کی..... "اور یاد رکھنا..... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اتنی کہ ان سارے پتے سالوں میں اللہ سے میں نے اس ایک دعا کے سوا اور کوئی دعا نہیں مانگی کہ تم مجھے مل جاؤ..... اور میری محبت کا یقین کر لو۔"

"تمہاری محبت کا یقین مجھے ہمیشہ رہا باری، میں کبھی بے یقین نہیں ہوئی۔" مجھے لگا میرے ہاتھوں کے ساتھ میری آواز بھی کانپ رہی تھی۔

"اور کبھی بے یقین مت ہونا دیرا۔" اس نے میرے لرزتے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔

"دیکھو دیرا ہو سکتا ہے میاں نے ہزارے کے اس

سے پوری عزت و احترام کے ساتھ تمہیں تمہارے
اماں، ابا سے مانگنے آئیں گے۔" باری نے مجھے
کتنا مان دیا تھا۔

"ہاں تمہاری شادی....." اماں جیسے جھوم گئی تھیں۔
"استانی جی تاریخ لینے آئیں گی، بہت جلد....."
باری نے کہا ہے اور ان کا ہی تو سب سے زیادہ حق
ہے تم پر..... اور باری بہت اچھا ہے..... ہے ناں؟"
وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔

میری ہلکی جھک گئیں..... رخساروں پر سرخی
دوڑ گئی۔

"ہم نے آج تک تیرے لیے کچھ نہیں کیا ناں
بالی، تیرے ابا کی خواہش ہے کہ دھوم دھام سے
تیری شادی کریں..... تیرا بھائی دعی میں ہے
ناں..... اچھا کھانا ہے، تیرے لیے بھی زیور بنا کر
دکھا ہے میں نے..... ہم سے تمہارے معاملے میں جو
کوئی بات ہوئی ہے، معاف کر دینا لیکن میں نے تو
صرف تمہارا بھلا چاہا تھا۔"

"اماں..... اماں....." میں ایک بار پھر ان
سے لپٹ گئی۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے اماں..... کچھ بھی
نہیں..... بس آپ کی محبت مجھے مل گئی ہے
ناں....." میری آواز میں نمی گھل گئی تھی اور اماں کی
آنکھیں برس رہی تھیں..... اور مجھے یوں لگ رہا تھا
جیسے ایک عمر کی آبلہ پائی کے بعد زخموں کو سر ہم مل گیا
ہو..... اور میرا خالی دل محبتوں سے لبریز ہو گیا
ہو..... میں نے اماں کے کندھے پر سر رکھے، رکھے
باری کی طرف دیکھا۔ جو آنکھوں میں محبتوں کا جہاں
بسائے مجھے ہی دیکھ رہا تھا..... اور یہ میں بھی سویرا
اقبال..... جو ہمیشہ خود کو کمتر اور مظلوم سمجھتی رہی.....
لیکن آج میرے ارد گرد کتنے رنگ تھے اور روشنیاں
تھیں، محبتیں تھیں۔



ڈالے ابا کے حق کے لیے لاری تھیں۔
"اماں.....!" میں باری کا ہاتھ چھڑا کر ان
کی طرف بھاگی..... پترا، اماں کے ہاتھ سے
چھوٹ کر گر گیا..... وہ تیر کی طرح میری طرف آئی
تھیں..... دوسرے ہی لمحے ہم ایک دوسرے سے
لپٹی ہوئی تھیں۔

"بالی..... بالی یہ تو ہے ناں..... میری
بچی....." وہ بار بار میرا منہ چومیں، دونوں ہاتھوں
میں میرا چہرہ لے کر مجھے دیکھتیں..... آج ان کی
آنکھوں میں بھی سمندر سا مگے تھے۔ ابا بار بار کہیں
کے کونے سے آنکھیں پونچھتے تھے اور جمال حیران سا
مجھے دیکھتا تھا۔ اماں کے بازوؤں سے نکل کر میں ابا
سے لپٹ گئی۔

"ابا..... ابا....." میری ہلکی بندھ گئی۔
"چپ کر نہ رو جمل نہ ہو تو....." ابا ہو لے،
ہو لے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے تھے۔
شام تک میری چاروں بہنیں بھی اپنے اپنے
بچوں کے ساتھ آگئی تھیں۔ اور آنکھوں میں خوشگوار
حیرت لیے ہوئے مجھے گھیرے میں لیے بیٹھی تھیں۔
دانی، دعی میں تھا اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ۔
"دانی اب پتا نہیں کیا ہے؟" میں نے پوچھا
سے ہو لے سے پوچھا تھا..... لیکن جواب اماں نے
دیا تھا۔

"گھرو جوان ہے، تیری شادی پر بلاؤں گی
اسے یوں بھی سال بعد چھٹی پر آتا ہے۔ تب ہی
شادی کی تاریخ رکھوں گی۔" اماں کی آنکھیں چمک
رہی تھیں۔

"میری شادی.....؟" میں نے دھڑکتے دل
سے باری کی طرف دیکھا جو سامنے ہی چار پائی پر
جمال کے ساتھ بیٹھا تھا اور گا ہے، گا ہے مجھے بھی دیکھ
لیتا تھا..... اس نے راستے میں کہا تھا۔

"ویرا! میرے امی، ابو بہت جلد بہت چاہ